تاریخ و ادب

مصنّف

محمد نورالدین خان

حقوق اشاعت بحق مصنف محفوظ ہیں

سلسلۂ مطبوعات ادبستان دکن

نام کتاب : تاریخ و ادب
مصنف : محمد نورالدین خاں
تعداد صفحات : (۲۴۴)
سنہ اشاعت : اپریل ۱۹۹۲ء
تعداد اشاعت : (۵۰۰) پانچ سو

کتابت : محمد عبدالروف خوشنویس
سرورق : سلام خوشنویس

طباعت لیتھو : دائرہ پریس چھتہ بازار، حیدرآباد
طباعت سرورق و تصاویر :
اسپیڈ آفسیٹ پرنٹرس (راحت کدہ، رویدہ فرح کالونی) سعید آباد۔ حیدرآباد
قیمت : پچاس روپے

★ جلدسازی : حفیظیہ بک بائینڈنگ ورکس چھتہ بازار، حیدرآباد
★ تصاویر : پاکیزہ اسٹوڈیو، یاقوت پورہ

ملنے کے پتے :
اسٹوڈنٹس بک ڈپو، چارمینار، حیدرآباد
حسامی بک ڈپو، مچھلی کمان۔ حیدرآباد
مصنف : 356-6-20
ڈیوڑھی نواب شرف جنگ قیام، چبوترہ سید علی، حیدرآباد

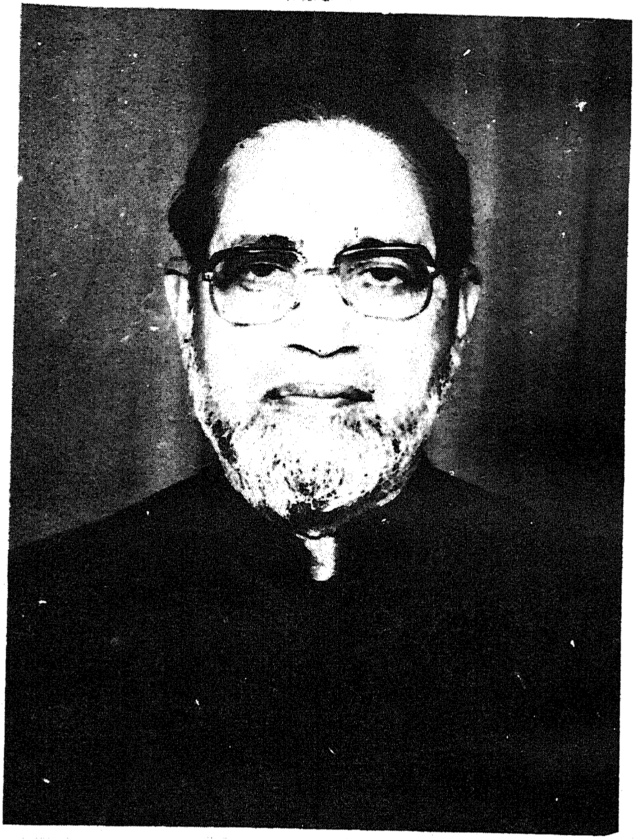

مصنّف محمّد نورالدّین خانؒ

فہرست

نشان سلسلہ	عنوان	صفحہ نمبر
۱	انتساب	
۲	ایک حقیر علمی پیشکش	۷
	[تاریخ]	
۳	شہر حیدر آباد کی پہلی مسجد	۹
۴	محبت کی یادگار پرانا پل	۱۳
۵	تالاب ماں صاحب	۱۵
۶	حیات بخش بیگم یا حیات بخشی بیگم	۱۹
۷	شہر حیدرآباد کے چار قدیم پل	۲۰
۸	مکہ مسجد میں آصف جاہی قبور	۲۷
۹	مکہ مسجد میں مقبرہ سلاطین آصفیہ	۳۵
۱۰	مسجد جودی اور مزار آصف سابع	۴۸
۱۱	سواری شاہانہ اور عوام کی تکلیف کا احساس	۵۹
۱۲	جمال صاحب میاں	۶۲
۱۳	چبوترہ سید علی	۶۷
۱۴	نواب میر محبوب علی خاں اور سانپ کا عمل	۷۰
۱۵	وکٹوریہ زنانہ اسپتال کی تقریب تنصیب سنگ بنیاد	۷۵
۱۶	حضور نظام کی اقتداء میں نماز	۷۸
۱۷	نواب ولی الدولہ بہادر کا سفر حج	۸۰
۱۸	حیدرآباد کے تاریخی واقعات شاعری میں	۸۱
۱۹	بیرونی مشاہیر ادب اور حیدرآباد	۸۷
۲۰	شاہان بے تاج پر ایک نظر	۹۵
۲۱	رستم زمان غلام محمد گاما (پہلوان)	۱۰۸
۲۲	استاد محمد بن علیبی پہلوان	۱۲۶
۲۳	مولوی عبدالحق کی اردو لغت اور ریاست حیدرآباد	۱۳۲

صفحہ نمبر	عنوان	نشان سلسلہ
	[ادب]	
۱۳۸	شاعرہ عرس حضرت فیض کی غزلیات کا پہلا مجموعہ	۲۴
۱۴۴	حبیب اللہ ذکا کی اردو ہجو	۲۵
۱۵۰	اعلیحضرت غفران مکان نواب میر محبوب علیخان آصف کی غزل پر خمسے	۲۶
۱۵۳	مہاراجہ کشن پرشاد شاد کا خط نواب عزیز یار جنگ کے نام	۲۷
۱۵۸	شاعری میں مہاراجہ شاد کے استاد	۲۸
۱۶۳	مہاراجہ شاد کی تاریخ وفات	۲۹
۱۶۵	معشوقہ سرشار ہکرم	۳۰
۱۶۷	رسا کے مصرعوں پر حضور نظام آصف سابع کی تضمین	۳۱
۱۷۰	بے نظیر شاہ وارثی کو بلا طلب و سوال وظیفہ	۳۲
۱۷۴	والا شان شہزادہ نواب معظم جاہ بہادر شجیع کے دو شعر	۳۳
۱۷۶	ڈاکٹر عباس علیخان لمعہ کے کلام پر اصلاح	۳۴
۱۸۱	یاس یگانہ چنگیزی کی ملازمت و ترقی	۳۵
۱۸۳	شاعری جوہر خداداد	۳۶
۱۸۵	شعرائے اردو کی حاضر جوابی	۳۷
۱۸۶	حضرت عشقی اور ان کے تذکرہ نویس	۳۸
۲۰۰	تاباں ایک شاعر ایک انسان	۳۹
۲۰۱	حلمی آفندی	۴۰
۲۱۳	و اتفاقی شعر	۴۱
۲۱۷	آخری چہار شنبہ	۴۲
۲۱۹	دکن کا ایک نقاد	۴۳
۲۳۷	صدق جائسی مہاراجہ شاد کے دربار میں	۴۴
۲۴۲	حسن ترجمہ	

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنتساب

بکمالِ ادب و اخلاص میرے کرم فرما

جناب شبلی یزدانی صاحب اور

جناب سید عبد الحفیظ صاحب۔

کے نام

جن کی رہنمائی اور فیضانِ صحبت نے لکھنے کا حوصلہ

عطا کیا۔ گرچہ خُردیم نسبتے ست بزرگ!

محمد نورالدین خان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایک حقیر علمی پیش کش

مقامی اخباروں اور رسالوں میں وقفہ وقفہ سے میرے مراسلے اور مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان میں سے بعض تاریخی، ادبی نوعیت کے ہیں اور بعض تحقیقی ہیں۔ ان مضامین کو علمی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا اور عام قارئین نے بھی اظہار پسندیدگی فرمایا۔ یہ مضامین ویسے دیکھنے میں معمولی موضوعات پر ہیں لیکن درحقیقت اہمیت کے حامل اس لیے ہیں کہ یہ ان تاریخی حقائق پر مبنی ہیں جن پر کسی کی نظر نہیں گئی۔ اگر کسی نے کچھ لکھا بھی ہے تو وہ بے اصل اور سرسری طور پر اظہار خیال کے سوا کچھ نہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ غیر ثقہ روایتوں اور افسانہ طرازی میں تاریخی حقائق گم ہوگئے ہیں۔ بعضوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ تاریخ کیا ہے جھوٹ کا ایک پلندہ ہے۔ عصر حاضر کے محققین جو ریسرچ اسکالر کہلاتے ہیں ان میں سے بیشتر کی تحقیق کا انحصار ان ہی افسانوں اور سنی سنائی بے بنیاد روایتوں پر ہوتا ہے۔ میں نے کبھی اپنے مضامین میں قدیم یا جدید مورخین کی تحقیق کو "خانے بستہ را بستن" کے مصداق اپنے الفاظ میں بیان کرنے کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ ذاتی علم اور عینی شاہدہ کی روشنی میں حقائق کی تلاش کی ہے اور آثار و واقعات کی تطبیق و موازنہ سے کام لیا ہے۔ غرض کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں بڑی محنت اور جد و جہد کی ہے۔

یہ مضامین موقتی طور سے اخباروں میں شائع ہوکر منظر عام پر تو آگئے لیکن اخباروں کی ایک روزہ زندگی کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے گم ہوگئے

اور صاحب ذوق قارئین کی بغایت توجہ سے محروم رہے۔ اس لیے میں نے ان پراگندہ اور منتشر مضامین کو یکجا کر کے مجموعہ کی شکل میں شائع کرنا مناسب سمجھا۔ اس علمی سرمایہ کو میں اپنی حد تک بوجوہ چند در چند عزیز رکھتا ہوں کہ میری نگاہ میں اس کی قدر ہے چاہے اس کو کوئی قدر کی نگاہ سے دیکھے یا نہ دیکھے :-

از ردّ و ہم قبول تو فارغ نشستہ ایم
اے آن کہ خوب ما نہ شناسی ززشت ما

ان مخلص احباب اور اصحاب کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے میرے طالب علمانہ علمی و تحقیقی کام کی حوصلہ افزائی کی۔ خصوصًا محترم جناب محبوب حسین جگر صاحب سب ایڈیٹر روزنامہ سیاست کا بہت سپاس گزار ہوں کہ آپ نے ابتداء ہی سے مری نگارشات کو اخبار میں جگہ دے کر میرا بڑا حوصلہ بڑھایا اور بعض باتوں میں میری رہنمائی بھی کی۔

ناسپاسی ہوگی اگر میں میرے دوست جناب محبوب علیخان صاحب اخگر کا شکریہ ادا نہ کروں۔ موصوف نے کتابت، طباعت کے مرحلوں اور متعلقہ دوسرے مسائل کی تکمیل میں مخلصانہ طور سے میرا ہاتھ بٹایا۔

محترم جناب محمود انصاری صاحب ایڈیٹر منصف کا بھی ممنون ہوں کہ میرے مراسلے اخبار میں شائع کرنے میں برابر تعاون فرمایا۔

آندھراپردیش اردو اکیاڈیمی کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ مضامین کی طباعت کے لیے جزوی رقم منظور کی۔

انصاف کے خواہاں ہیں نہیں طالب زرہم
تحسین سخن فہم ہے مومن صلہ اپنا (مومن دہلوی)

محمد نور الدین خان

۲۱؍ اپریل ۱۹۹۲ء

فون: 526423
مکان نمبر 356-6-20
دیوڑھی نواب مشرف جنگ نیاقی، چبوترہ سید علی، حیدرآباد دکن اے پی

تاریخ

شہر حیدرآباد کی پہلی مسجد

بانیِ سلطنت قطب شاہی سلطان قلی قطب الملک عرف بڑے ملک جب بحیثیت گورنر تلنگانہ اپنی جاگیر گولکنڈہ میں مقیم تھے تو انھوں نے پرانے قلعہ گولکنڈہ کو مضبوط بنیادوں پر استوار کیا اور وہاں عمارتیں بھی بنوائیں۔ تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہندوستان میں جہاں کہیں کسی راجہ بادشاہ امیر یا وزیر نے محل، باغ یا مقبرہ تعمیر کیا وہیں اعتقاداً مندر یا مسجد بھی تعمیر کی۔ چنانچہ تعمیر گولکنڈہ کے ساتھ سلطان قلی نے قلعہ گولکنڈہ کی جانبِ مغرب ایک مسجد بنائی جو جامع مسجد گولکنڈہ کے نام سے مشہور ہے۔ بات اگرچہ موضوعِ سخن کے دائرے سے باہر ہے لیکن کہنے کو جی چاہتا ہے کہ دکن کی سرزمین کی آب و ہوا میں وفاداری کی خوبو ایک نمایاں صفت ہے چنانچہ قطب الملک بانیِ سلطنتِ قطب شاہی اور نظام الملک بانیِ مملکتِ آصفیہ دونوں کے کردار اسی وصف سے متصف ہیں۔ بہمنی حکومت کے زوال پذیر دور میں جب ماتحت گورنروں نے علمِ بغاوت بلند کیا اور اپنی اپنی آزاد حکومتیں قائم کرلیں تو سلطان قطب الملک آخری گورنر تھے جنھوں نے اپنی حکومت قائم کی لیکن انھوں نے کمزور اور نااہل آخری سلاطینِ بہمنیہ سے اپنے روابط وفادارانہ رکھے۔ ان کے نام سلطان قلی میں "سلطان" نام کا جز ہے۔ ان کے مزار کے کتبہ پر بھی نام کے ساتھ لفظ شاہ کندہ نہیں ہے بلکہ بہمنی بادشاہ کا عطا کردہ خطاب قطب الملک کندہ ہے۔ یہ اسی وفادارانہ بلند حوصلگی کا ثبوت ہے کہ حکومت قطب شاہی اور اس کے تمام سلاطین کے نام کے ساتھ لفظ قطب بطور یادگار شامل ہے۔

جامع مسجد گولکنڈہ کے باب الداخلہ کے اوپر ایک کتبہ بہ زبانِ عربی

بشکلِ طغرا لکھا ہوا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ غازی محمود شاہ ابن محمد شاہ بہمنی کے عہد میں سلطان قلی المخاطب بقطب الملک نے سنہ نو سو چوبیس ۹۲۴ میں یہ جامع مسجد تعمیر کی۔

حیدر آباد کے آثار، عمارت، مقابر اور مساجد پر جن محققین اور مورخین نے کتابیں لکھی ہیں تو انھوں نے بتایا ہے کہ قطب شاہی دور میں شہر حیدر آباد میں جو پہلی مسجد بنی وہ چار مینار کے قریب جانب شمال جامع مسجد ہے جس کی تعمیر سلطان محمد قلی قطب شاہ نے کی۔ یہاں کوئی ایسا کتبہ نہیں ہے جس پر سنہ بنائے مسجد کندہ ہو۔ محراب مسجد کے اطراف سنگِ سیاہ کے حاشیے پر آیاتِ قرآنی خطِ ثلث میں کندہ ہیں اور آخر میں کاتب نے اپنا نام جمال الدین بن جلال الدین محمد الفخار الشیرازی لکھا ہے اور دہ میں سنہ ایک ہزار چھ بھی کندہ کیا۔ یہاں ذرا سی الجھن یہ ہوتی ہے کہ کاتب نے جو سنہ لکھا ہے آیا وہ سنہ تکمیل کتبہ ہے یا سنہ بنائے مسجد، جامع مسجد کے مغرب میں قدیم باب الداخلہ (جس میں اب شفیع بکڈپو قائم ہے) کی پیشانی پر جو سات اشعار کا کتبہ ہے۔ اس کا آخری شعر ہے:

کسے پرسد اگر تاریخ او را
زہے عالی بنائے خیر گوئی

"زہے عالی بنائے خیر" (۱۰۰۶) کے حروف کے اعداد جوڑنے سے ایک ہزار چھ برآمد ہوتا ہے۔ اس طرح کاتب نے جو سنہ لکھا ہے وہ سنہ بنائے مسجد ہی ہے۔

آیئے اب ہم آپ کو ایک اور مسجد لے چلتے ہیں جو چار مینار کے قریب مکہ مسجد کے سامنے اور قلبِ شہر میں واقع ہے۔ نام اس مسجد کا بیگم کی مسجد ہے۔ محققین کی نگاہِ تحقیق سے یہ مسجد اوجھل رہی اور کسی تاریخ یا حیدر آباد کے آثار پر لکھی گئی کتاب میں اس کا کوئی ذکر یا داخلہ نہیں ہے۔ [البتہ حیدر آباد کے محقق جناب عمر یافعی مرحوم نے اس مسجد پر ایک مضمون لکھا ہے] اس کی وجہ یہ رہی کہ عرصے تک یہ مسجد بہت جنگ، تہنیت یار الدولہ کی ڈیوڑھی کی اونچی دیواروں کے حلقے میں پوشیدہ رہی۔ مغربی جانب جہاں اب پان کی دکانیں

و منزلہ عمارت کھڑی تھی اور اس کے پیچھے دوکانیں تھیں۔ وہیں تہنیت یار الدولہ
یوڑھی کا اونچا بڑا اور قدیم پھاٹک تھا۔ جب دواخانہ یونانی کی تعمیر شروع
تو اطراف کی ڈیوڑھیاں اور مکانات منہدم ہوئے تو یہ مسجد اُبھر کر منظرِ
پر نمایاں ہوگئی۔

محرابِ مسجد کے اطراف صاف چکنے سنگِ سیاہ کا حاشیہ ہے جس پر آیاتِ
اُبھرے ہوئے بہت ہی خوب صورت عربی خط میں منقوش ہیں۔ خاتمے پر
نے اپنا نام جمال الدین حسین الفجار لکھا ہے۔ کمانِ محراب کی پیشانی پر سنگِ
کی پٹی پر بخط عربی بطرزِ طغرا حضرت محمدؐ۔ حضرت علیؓ اور اماموں کے نام
ہیں اور آخر میں سنہ ایک ہزار دو [۱۰۰۲] کے اعداد کندہ نظر آتے ہیں۔
تاریخ بنائے مسجد کا کتبہ کسی وقت یہاں ہوگا مگر امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں
ں کا وجود نہیں ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے واضح کیا ہے کہ جامع مسجد چار مینار
حرابی کتبے پر کاتب نے جو سنہ ایک ہزار چھ (۱۰۰۶) لکھا ہے وہ سنہِ تعمیر
ہی ہے اس طرح اس مسجد کی محراب کے اوپر کاتب نے جو سنہ ایک ہزار
[۱۰۰۲] لکھا وہ یقیناً سنہِ تعمیر مسجد ہی ہے۔ یہ ایک دل چسپ حقیقت ہے
دونوں مساجد کے کتبوں پر خوب صورت خط میں لکھنے والے کاتب وہی
ب شاہی دور کے ماہرِ فن خطاط جمال الدین حسین ہی ہیں۔ دونوں مسجدوں
کتبوں کی نفیس دل کش اور بے مثل تحریر میں اسی لیے یکسانی پائی جاتی ہے۔
کتبہ نہ ہونے سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس مسجد کی تعمیر کس نے کی۔ لیکن اس
رزِ تعمیر وہی ہے جو قطب شاہی مساجد کی خاص خصوصیت ہے وہی چار
کمانوں پر قائم گنبد نما چھت، وہی طاق وہی محراب۔ غور کرنے سے یہ حقیقت
ہوتی ہے کہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کا دورِ حکمرانی سنہ نو سو اٹھاسی
(۹۸۸) سے ایک ہزار بیس [۱۰۲۰] رہا ہے یقیناً جب سنہ ایک ہزار ہجری
مشہور عمارت چار مینار بنی تو اس کے پہلو میں بادشاہ کے حکم سے یہ مسجد
ہوئی کیوں کہ نو تعمیر شدہ شاہی عمارت کے قریب کسی اور کو مسجد بنانے

کی اجازت یا مجال نہیں ہو سکتی۔ پھر جب بانیِ شہر حیدرآباد محمد قلی کی مناجات بارگاہ خداوندی میں قبول ہوئی۔

مرا شہر لوگاں سوں معمور کر
رکھیا جوں تو دریا میں منِ یا سمیع

تو شہر کی آبادی میں دن دونا اضافہ ہونے لگا۔ بڑھتی ہوئی آبادی کے پیشِ نظر بادشاہِ وقت نے چار مینار کے قریب ایک بڑی جامع مسجد کی تعمیر کی اور آخر میں مکہ مسجد جیسی عظیم الشان مسجد شہر حیدرآباد کی زینت بنی۔

سلطان قلی قطب الملک نے گولکنڈہ میں جو جامع مسجد بنائی۔ اس کا طرزِ تعمیر قطب شاہی دور کی مساجد سے مختلف ہے۔ قطب شاہی مساجد کا طرزِ تعمیر مخصوص نوعیت کا ہے اور یہ آرٹ قطب شاہی دور کی تمام مساجد میں یکساں موجود اور نمایاں ہے۔ چاہے وہ کسی بادشاہ کی تعمیر شدہ ہو یا کسی امیر کی۔ زیرِ بحث مسجد شہر حیدرآباد اور قطب شاہی دور کی پہلی مسجد ہے۔ اور قطب شاہی طرزِ تعمیر کا پہلا نمونہ اور ماڈل بھی یہی مسجد ہے۔ اس کے بعد چھوٹی اور بڑی جتنی بھی مسجدیں بنیں اسی ماڈل کے طرز پر بنیں۔

اس میں کوئی شک نہیں جامع مسجد گولکنڈہ حیدرآباد کی قدیم مسجد ہے لیکن ہم اسے قطب شاہی دور کی مسجد نہیں کہہ سکتے کیوں کہ سلطان قلی نے بحیثیت بادشاہ اس کی تعمیر نہیں کروائی تھی بلکہ بحیثیت گورنر یا نائب حکومت بہمنیہ یہ مسجد بنائی تھی۔ زیرِ بحث مسجد پہلی قدیم قطب شاہی مسجد ہے جو جامع مسجد چار مینار سے چار سال پہلے اور مکہ مسجد سے پچیس[۲۵] سال پہلے شہر حیدرآباد میں تعمیر ہوئی۔ چار سو پانچ سال اس کی عمر ہونے کے باوجود مسجد سانچے میں ڈھلی معلوم ہوتی ہے۔ گچ اور چونا اتنا سخت جان ہے کہ ابھرے ہوئے نازک نقش و نگار اسی حالت میں ہیں جیسے بنے تھے۔

عرصہ تک یہ مسجد تہنیت یارالدولہ کی نواسی نادرالنساء بیگم کی زیرِ نگرانی رہی۔ لیے یہ بات عینی معلوم ہوتی ہے کہ ان کے قبضہ و تصرف میں تھے

نسبت سے یہ مسجد بیگم کی مسجد کے نام سے مشہور ہوئی۔
ہے۔ سوائے جمعہ اور عیدین، پانچ وقت کی نماز کثیر جماعت
ہے۔ امام اور موذن کا انتظام ہے۔ مسجد کی انتظامی کمیٹی
علیم اور قرأت کا مدرسہ قائم ہے۔ استاد محمد بن علیلی صاحب
ں کو روزآنہ صبح مسجد میں پڑھاتے ہیں۔
عرض کرنا ہے کہ تحقیق کسی کی بھی ہو قول فیصل ہے نہ حرف
حر زخار کا کوئی کنارہ نہیں نہ اس کٹھن راستہ کی کوئی منزل
رخین اور محققین کرام کی نظر میں اس مسجد سے بھی کوئی مسجد
قدیم ہو تو ضرور تبصرہ کریں۔ یقیناً دکن کی تاریخ میں نئے
گا۔

محبت کی یادگار پُرانا پُل

کے شمال مغرب میں پُرانا پُل واقع ہے جو کاروان دستعد
ں کے شمالی کنارے سے شروع ہو کر جنوبی کنارے پر ختم
ڈہ کی عمارتوں کے بعد سلطان ابراہیم قطب شاہ نے
طب شاہی دور میں اسے پل "نردا" کہتے تھے (نردا تلگو زبان
ہیں)۔ آصف جاہی عہد میں پل کی قدامت کی وجہ پُرانا پل
وقت پل پر کہیں کوئی کتبہ نصب نہیں ہے۔ لیکن تمام تاریخ
ریخ آغاز بنائے پُل "صراط المستقیم ۹۸۱" لکھا ہے اور تاریخ
ذیل ہے ۔

رتخت او گذر ما و ما براو گذریم!
از این سبب شدہ تاریخ او گذرگہہ ما

۹۸۶ ھ

دکن کی قدیم فارسی تاریخ "ظفرہ" کے مولف نے ظفرہ کے حروف کے اعداد کو سنہ تالیف بنایا ہے یعنی ۱۱۸۵ھ گویا یہ تاریخ حکومت قطب شاہیہ کے خاتمہ ۱۰۹۸ھ کے ۸۷ سال بعد پایۂ تکمیل کو پہونچی۔ مولف تاریخ "ظفرہ" گردھاری لال نے بعنوان "بنائے جسر یعنی پل" لکھا ہے کہ چونکہ شہر اور قلعہ کے درمیان دریائے موسیٰ واقع ہے موسم برسات میں طغیانی کے سبب عبور کرنا دشوار تھا۔ اس لیے خسرو زماں نے اس مضبوط پل کی تعمیر کی مولف کے بیان سے واضح ہے کہ رفاہ عام کی غرض سے اس پل کی تعمیر ہوئی۔

"ظفرہ کے بعد دکن کی جو مستند اور مشہور تاریخ ملتی ہے وہ گلزار آصفیہ موتفہ جناب خواجہ غلام حسین خاں ہے جو سنہ ۱۲۶۰ھ فارسی میں لکھی گئی یعنی سلطنت قطب شاہی کے زوال کے ایک سو باسٹھ ۱۶۲ سال بعد صاحب گلزار آصفیہ نے اس پل کے بنانے کی وجہ یہ بتائی کہ سلطان ابراہیم قطب شاہ کا شہزادہ محمد قلی قطب شاہ بھاگ متی کے عشق میں گرفتار ہوگیا تھا۔ جو موسیٰ ندی کے اس پار موضع چچلم میں رہتی تھی۔ شہزادہ اس سے ملنے جایا کرتا تھا۔ ایک دفعہ شہزادہ حسبِ معمول رات کے وقت کوہ پیکر ہاتھی پر سوار ندی کے کنارے آیا۔ لیکن بہ سبب طغیانی ندی چڑھاؤ پر تھی۔ ہاتھی کو بھی طوفانی ندی میں قدم ڈالنے کی ہمت نہ ہوئی۔ شہزادہ کے دل میں جذبۂ عشق جوش زن تھا۔ اپنے خاص گھوڑے پر فوراً سوار ہوکر گھوڑے کو بھرپور ندی میں ڈال دیا اور صحیح وسلامت دوسرے کنارے پہونچ گیا۔ جب پرچہ نویسوں نے بادشاہ کو اس واقعہ کی اطلاع دی تو وہ بہت متاثر ہوا۔ سجدۂ شکر بجا لایا اور فوراً ایک مستحکم پل کی تعمیر کا حکم دیا۔

غور کرنا یہ ہے کہ مستند تاریخ نگاروں نے صاحب گلزار آصفیہ کے بیان کردہ افسانہ کو صحیح تسلیم کرتے ہوئے اس واقعہ کو پل کی تعمیر کی بنیاد قرار دیا اور محبت کی یادگار بتایا۔ ملاحظہ ہو مآثر دکن، تاریخ گولکنڈہ

سُلطان محمد قلی قطب شاہ وغیرہ وغیرہ۔ اب عرض کرنا یہ ہے کہ سُلطان محمد قلی قطب شاہ کی تاریخ پیدائش ۹۷۳ھ پر بغیر کسی اختلاف تمام تاریخ نگاروں کا مکمل اتفاق ہے۔ اگر ہم متذکرہ افسانہ عشق کو تسلیم کریں تو یہ ماننا پڑے گا کہ جب اِس پُل کی بنیاد ۹۸۱ھ میں رکھی گئی تو اُس وقت شہزادہ کی عمر ۸ سال تھی [۹۸۱ ـــ ۹۷۳ = ۸] آٹھ سال عمر کے کمسن نابالغ شہزادہ کا اپنی محبوبہ بھاگ متی سے والہانہ عشق اور شوق ملاقات میں بھیانک رات کو طوفان بدوش ندی میں گھوڑا ڈال کر لہروں سے کھیلتے ہوئے دوسرے کنارے پہونچ جانا دنیائے عشق کا حیرت انگیز قابلِ فخر کارنامہ اور تاریخ کا عجوبہ روزگار نادر واقعہ ہے۔ ناچیز بالغ نظر ناظرین سے التماس کرتا ہے کہ تاریخی حقائق کی روشنی میں مجھ گم کردہ راہِ حقیقت کی رہبری فرمائیں۔

تالاب ماں صاحب

تالاب ماں صاحب عہدِ قطب شاہیہ کے مشہور تالابوں میں سے ایک رہا ہے۔ قطب شاہی دور میں یہ تالاب جہاں واقع تھا اس علاقہ کو خیرآباد کہتے تھے۔ اے سی گارڈز سے مہدی پٹنم کے راستے مغرب کی جانب ایک طویل اور عریض نشیبی علاقہ نظر آتا ہے یہی نشیبی زمین اس مٹے ہوئے تالاب کا پتہ دیتی ہے۔ مشرقی سمت مٹی کا بند باندھ کر پانی روکا گیا تھا اور یہی بند آج بھی آمد و رفت کے لیے پُل کا کام دیتا ہے۔ پانی سے کبھی یہ تالاب بھرپور رہتا تھا۔ جس کا پانی آبرسانی اور آبپاشی کے اغراض کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ تالاب کے اطراف کھیت تھے۔ زراعت ہوتی تھی۔ آج سے تیس چالیس سال قبل تک یہاں کچھ کھیت باقی تھے۔ لہلہاتے کھیتوں کی جگہ اب اونچی اونچی عمارتیں کھڑی ہیں۔ برسوں سے یہ تالاب خشک اور

پایاب ہے نہ اس میں پانی ہے نہ اس کے اطراف کھیت، پایاب تالاب میں عوام کے لیے آج کل گورنمنٹ کی جانب سے چمن بنا دیا گیا ہے۔ سڑک پر کھڑے ہو کر نظر دوڑاتا ہوں تو مجھے بے ساختہ مخدوم کا یہ شعر یاد آجاتا ہے ؂

نہ اب وہ کھیت باقی ہے نہ ہے آبِ رواں باقی
مگر اس عہدِ رفتہ کا ہے اک دھندلا نشاں باقی

صدیاں گزر جانے کے بعد بھی اس دھندلے نشان کو تالاب ماں صاحب کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ کیوں نہ یاد کریں جب کہ اس تالاب کو بنانے والی نیک دل خاتون نے اسے صرف کارِ خیر اور ثوابِ جاریہ کے جذبہ سے بنایا تھا۔ اس تالاب کے جنوب مغربی سمت لب سڑک دو کمانوں والی پتھر کی چھوٹی عمارت ایستادہ تھی اور اس کے اندر پتھر کی دیوار میں چکنے پتھر کا کتبہ موجود تھا۔ جس کے حروف اُبھرے ہوئے تھے یہ کتبہ اس عمارت میں ڈسمبر ۱۹۸۶ء کے پہلے ہفتہ تک باقی تھا۔ لیکن آخر ڈسمبر ۱۹۸۶ء یہ تاریخی عمارت سڑک کی توسیع کی زد میں آگئی اور دیکھتے ہی دیکھتے زمین کے برابر ہوگئی۔ اب نہ وہ عمارت ہے نہ وہ یادگار کتبہ۔ یہ تو انقلابات ہیں زمانے کے لیکن ان تاریخ نگاروں کا احسان ہے جنھوں نے شوق تحقیق میں مشقتیں اُٹھا کر قدیم عمارتوں، قبروں اور کتبوں پر تحقیقی کام کیا۔ فوٹوز لیے اور چربے اتارے اور انھیں اپنی کتابوں میں آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کر دیا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

ایسی ہی یادگار کتابوں میں جناب سید علی اصغر بلگرامی مرحوم سابق ناظم آثار قدیمہ حکومت حیدرآباد دکن کی دو کتابیں مآثر دکن (اردو) اور لینڈ مارکس آف دکن (انگریزی) ہم اہلِ دکن کے لیے قیمتی سرمایہ ہیں۔ جن میں عہد قطب شاہی اور دورِ آصف جاہی کی بعض قدیم تاریخی

عمارتوں وغیرہ کے فوٹو محفوظ ہیں۔ حوادث روزگار کے ہاتھوں تاریخی آثار صفحہ ہستی سے ملیا میٹ ہوجائیں گے لیکن کاغذی پیرہن میں ان کے نقوش پتھر کی لکیر سے زیادہ پائیدار بن کر ہمیشہ باقی رہیں گے۔

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

تالاب لال جان صاحب کا متذکرہ کتبہ نہ جانے کس کے قبضہ و تصرف میں ہے۔ لیکن اس کتبہ کا عکس مآثر دکن میں موجود ہے۔ کتبہ فارسی میں ہے مختصراً اس کا اردو ترجمہ یہ ہے کہ اس تالاب کو عالی مرتبت خانم آغا بنتِ میر مقصود علی طباطبا نے بغرض رفاہ عام اور ثواب جاریہ خیرآباد میں تعمیر کیا اور اس تالاب کو بادشاہ نے شاہ خوندکار ابن شاہ محمد الحسینی کو انعام میں عطا کیا۔ کتبہ پر ۱۰۳۴ درج ہے (اصل کتبہ کے لیے ملاحظہ ہو مآثر دکن) تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خانم آغا شہزادہ محمد مرزا امین ابن سلطان ابراہیم قطب شاہ کی بیوی، سلطان محمد قطب شاہ کی والدہ حیاتِ بخش بیگم کی ساس اور سلطان عبداللہ قطب شاہ کی دادی تھیں۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ شاہ خوندکار خانم آغا کے نواسے تھے جن کو یہ تالاب انعام میں دیا گیا۔ خانم آغا اور شاہ خوندکار کی قبریں سلطان محمد قطب شاہ کے گنبد کے اندر موجود ہیں۔ قبروں پر کتبے لگے ہوئے ہیں۔ خانم آغا کے مزار کا کتبہ شاندار القاب سے مزین ہے۔ "علیا حضرت خدیجہ مرتبت مریم مکانی بلقیس زمانی صالحہ عفیفہ رابعہ راکعہ ساجدہ صایم خانم آغا ۱۰۳۱" مزار کے کتبوں سے ظاہر ہے کہ سلطان محمد قطب شاہ کا انتقال ۱۰۳۵ اور شاہ خوندکار کا ۱۰۴۵ میں ہوا تھا۔ تاریخ بنائے تالاب کا کتبہ دستور کے موافق یقیناً ہوگا۔ مگر دست برد زمانہ سے اب ناپید ہے مگر یہ بات یقینی ہے کہ اس تالاب کو خانم آغا نے اپنی زندگی میں اپنی وفات ۱۰۳۱ سے قبل بنایا تھا۔ اور اسے سلطان محمد قطب شاہ نے اپنے انتقال ۱۰۳۵ سے ایک سال پہلے ۱۰۳۴ میں اپنے بھانجے خوندکار

کو انعام میں عطا کیا۔ حیات بخش بیگم سلطان محمد قطب شاہ کی ملکہ تھیں۔ اگر یہ تالاب ان کا بنایا ہوا ہوتا تو یقیناً خانم آغا کے بجائے حیات بخش بیگم کا نام کتبہ کی زینت ہوتا۔ تاریخ نگاروں کا یہ کہنا ہے کہ مغلیہ دَور میں محل کی بڑی اور با اثر خواتین کو بیگم صاحبہ کا لقب دیا جاتا تھا اس طرح محل کی ایسی ذی مرتبہ بیگمات اور ماؤں کا لقب قطب شاہی عہد میں "ماں صاحب" ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ماں صاحب کا لقب کسی ایک شخصیت تک محدود نہ تھا۔ اس لحاظ سے خانم آغا بھی ماں صاحب کے لقب سے پکاری جاتی تھیں اور حیات بخش بیگم بھی ماں صاحب کے لقب سے مشہور ہوئیں متذکرہ کتبہ پر خانم آغا کا نام اور ذِکر واضح الفاظ میں بحیثیت بانی تالاب موجود ہے۔ لیکن یہ بڑا تعجب ہے کہ جناب غلام حسین خان صاحب اپنے تذکرہ گلزار آصفیہ میں اس تالاب کو حیات بخش بیگم کا بنایا ہوا بتاتے ہیں۔ پھر تعجب بالائے تعجب یہ ہے کہ دکن کے بعض مشہور مورخ اور محقق بھی اس تالاب کو حیات بخش بیگم سے منسوب کرتے ہوئے اسے ان کے رفاہی کارناموں میں شامل فرمایا ہے۔ خانم آغا (ماں صاحب) نے جس نیک مقصد اور صالح نیت سے تالاب بنایا اس کا اجر ان کو اللہ کے دربار سے ضرور ملتا ہوگا۔ لیکن پھر بھی ان کے کام اور نام کو نظر انداز کر کے کسی اور کے اعمال نامہ میں شامل کرنا انصاف کی بات نہیں۔ میں نے جو دیکھا، پڑھا اور سمجھا وہ لکھا۔ یہ بھی تحقیق کوشش کی ایک کڑی ہے۔ اصحابِ نظر کی رائے میرے لیے رہبری کا سبب ہوگی۔

حیات بخش بیگم یا حیات بخشی بیگم

حیات بخش بیگم عرف حیات مال صاحب سلطنت قطب شاہیہ کے پانچویں بادشاہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کی بیٹی، چھٹے بادشاہ سلطان محمد قطب شاہ کی بیوی اور ساتویں بادشاہ سلطان عبداللہ قطب شاہ کی والدہ کا نام ہے۔ حیات بخش بیگم کا شاندار گنبد مقابر سلاطین قطب شاہیہ (گولکنڈہ) میں موجود ہے۔ قبر کے کتبہ پر "وفات جنت مکانی حیات بخش بیگم بتاریخ بست و ہشتم ماہ شعبان شب سہ شنبہ ۱۰۷۷" کندہ ہے۔ دکن کی قدیم تاریخوں اور تذکروں میں حیات بخش بیگم ہی نام لکھا ہوا ملاحظہ ہو تاریخ قطب شاہی، گلزار آصفیہ، محبوب الزمن، آثر دکن، گلمپزس آف دی نظامس ڈومینین اور پکٹوریل حیدرآباد وغیرہ۔ لیکن بعض مشہور مورخ اور محققین نے اپنے تذکروں میں حیات بخش بیگم کے بجائے حیات بخشی بیگم نام لکھا ہے۔ جیسے انگریزی تذکرہ ہسٹری آف میڈیویل دکن میں جناب ہارون خاں شیروانی صاحب نے (دی قطب شاہز آف گولکنڈہ حیدرآباد) جناب عبدالمجید صاحب نے "تاریخ گولکنڈہ" میں، جناب نصیر الدین ہاشمی صاحب نے "حیات بخشی بیگم" میں اور ڈاکٹر زور نے "سلطان محمد قلی قطب شاہ" میں اس ملکہ کا نام حیات بخشی بیگم لکھا ہے۔ آج کل مضمون نگار اپنے مضامین میں ان معروف محققین کے اتباع میں حیات بخشی بیگم ہی نام لکھ رہے ہیں۔ صحیح نام کی جو اہمیت ہے وہ اصحاب علم و دانش پر واضح ہے۔ ان حالات میں مجھ جیسے تاریخ کے طالب علم کے لیے صحیح نام کے تعین میں بڑی الجھن ہو رہی ہے۔ قارئین سے معروضہ ہے کہ اپنی اصابت رائے سے اس الجھن کو دور فرمائیں۔

شہر حیدرآباد کے چار قدیم پُل

"پُرانا پُل"

جب گولکنڈہ کی آبادی بڑھنے لگی تو حکومت قطب شاہیہ کے چوتھے بادشاہ سلطان ابراہیم قطب شاہ نے رود موسیٰ کے جنوب میں وسیع و عریض پُر فضا قطعہ زمین پر نئے شہر کے بسانے کا ارادہ کیا۔ اس مقصد کے لیے آمد و رفت کے پیشِ نظر اس پُل کی بنا ڈالی۔ یہ پُل شمال میں کاروان (مستعد پورہ) سے شروع ہو کر جنوبی کنارے پر ختم ہوتا ہے۔ پُل بائیس کمانوں پہ بنا ہوا ہے۔ موسیٰ ندی میں ہر سال تباہ کن طغیانی برپا ہونے کا اندازہ سلطان ابراہیم قطب شاہ کو تھا۔ اس لیے پُل کو نہایت مستحکم بنیادوں پر مضبوط گچ کے ساتھ سنگ بستہ بنایا اور استوار کیا۔ قطب شاہی دور میں اسے پُل نروا (نروا تلگو میں راستہ کو کہتے ہیں) کہتے تھے۔ مولف تاریخ ظفرہ گردھاری لعل نے اسے "جرِ عظیم" لکھا ہے (جر عربی میں پُل کو کہتے ہیں) آصف جاہی دور میں اس کی قدامت کی وجہ پُل قدیم یا پُرانا پُل کہنے لگے۔

حسبِ دستور کہیں نہ کہیں پُل پر کتبہ نصب ہوگا لیکن انقلابات زمانہ کے ہاتھوں اب اس کا وجود نہیں ہے البتہ محققین اور مورخین نے تاریخ بنائے پُل "صراط مستقیم" ۹۸۱ بتایا ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ پانچ سال بعد اس پُل کی تکمیل ہوئی۔ تاریخ تکمیل پُل تواریخ میں یوں درج ہے:

زحمت او گذر ما و ما بر او گذریم
از این سبب شدہ تاریخ او گذر گہِ ما

"گذرگہِ ما" سے مادہ تاریخ سنہ ۹۸۵ھ برآمد ہوتا ہے۔

بعض وقت ضروری ترمیم و مرمت اس پل کی ہوتی رہی چنانچہ اعلیٰحضرت غفرت منزل نواب سکندر جاہ بہادر کے دور میں سنہ بارہ سو چھتیس ۱۲۳۶ھ کی طغیانی کے بعد جو ترمیم ہوئی اس کا قطعہ تاریخ فرمودہ دیوان چندو لعل شادان آج بھی پرانے پل کے دروازہ کے اوپر پتھر کی تختی پر کندہ نظر آتا ہے۔

بعہد شاہ سکندر شہ تعمیر پل یکسر
زسعی راجہ چندو لعل از سابق بود بہتر
بہ شادان شد ندا "جائے غریبی" بہر تاریخش
زسیل انیک بود محفوظ چوں اندر صدف گوہر

مادۂ تاریخ "جائے غریبی" سے سنہ ۱۲۳۶ھ نکلتا ہے۔ پل کی ترمیم پورن سنگھ کی نگرانی میں ہوئی تھی اس لیے کتبہ کے دائیں طرف سنہ ۱۲۳۶ (۱۸۲۰ء) کے ساتھ "تحویل پورن سنگھ داروغہ" بھی کندہ کیا گیا ہے۔

قطب شاہی دور ہو یا آصف جاہی عہد ہر سال آنے والی قیامت خیز اور تباہ کن طغیانیوں کے باوجود چار سو ستائیس (۴۲۷) سال عمر کا یہ پل شکستہ اور از کار رفتہ نہیں ہوا۔ جب مولانا ظفر علی خاں کا قیام حیدرآباد میں تھا تو ان کی ادارت میں ماہ نامہ "دکن ریویو" شائع ہوتا تھا۔ اس رسالے کے مینیجر بدیع الزماں صاحب نے دکن ریویو اکتوبر سنہ ۱۹۰۸ء میں تاریخی ہلاکت خیز طغیانی کا حال "قیامت صغریٰ" کے عنوان سے لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "ندی کے چار پلوں میں سے تین کے پرخچے اڑ گئے یعنی مسلم جنگ کا پل، چادر گھاٹ پل اور نیا پل جو موجودہ فن انجینیری کی اعلیٰ کاریگری کا نتیجہ تھے خاص کر نئے پل کو پانی کی طغیانی نے روئی کی طرح دھنک ڈالا۔ البتہ پرانا پل جو زمانہ قدیم کی صنعت تعمیر کی یادگار ہے اور جو صدیوں سے آفات زمانہ کا مقابلہ کرتا چلا آرہا ہے جس کا پچھلے طوفانوں میں بھی بال بیکا نہ ہوا تھا سوائے اس پشتے کے جو زمانہ مابعد میں ہوئے تھے اور جو بہہ گیا ٹس سے مس نہ ہوا اور سینہ سپر کھڑے ٹھٹا رہا۔"

تمام مورخ اس پل کی مضبوطی کا شاندار الفاظ میں ذکر کرتے آئے ہیں۔ آج بھی بھاری بھاری ٹرکس، ہمہ اقسام کی سواریوں اور اژدحام رات دن اس پل پر سے گزرتا دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ پل پر کھڑے ہو کر دیکھئے تو محسوس ہوتا ہے گویا زبان حال سے کہہ رہا ہے۔

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

چادر گھاٹ پل

قدیم سے شہر حیدر آباد میں داخل ہونے کا واحد پل 'پرانا پل' ہی تھا۔ پرانے پل کی تعمیر کے دو سو پینسٹھ (۲۶۵) سال بعد اعلیٰ حضرت غفران منزل نواب میر فرخندہ علی خاں ناصر الدولہ بہادر آصف جاہ چہارم کی مسند نشینی [۱۲۴۴ھ] کے دو سال بعد رود موسیٰ پر دوسرا پل ۱۲۴۶ھ میں جو تعمیر ہوا وہ بمقام چادر گھاٹ بنایا گیا۔ یہ پل چادر گھاٹ پل کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن رزیڈنسی کے ایک انگریز انجینئر مسٹر الیفنٹ [OLIPHENT] کی نگرانی میں اس پل کی تعمیر ہوئی اس لیے الیفنٹ کے پل سے بھی موسوم ہے آج بھی پل کے جنوبی سمت پولس اسٹیشن سے متصل الکٹرک آفس کی عمارت پر بزبان انگریزی گچ کے ابھرے ہوئے الفاظ میں الیفنٹ برج سب اسٹیشن لکھا ہوا ہے۔

اس پل کی تعمیر کا مقصد رفاہی ہے۔ عوام کے لیے آمد و رفت کی سہولت پیدا کرنا تھا۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی تھی کہ انگریزوں کا اثر و رسوخ دیسی ریاستوں پر بڑھ رہا تھا۔ اس وقت کے انگریز ایلچی (رزیڈنٹ) میجر اسٹورٹ کو نظام سے ملنے کے لیے پرانے پل کا طول طویل راستہ طے کرنے کے بجائے قریبی راستہ درکار تھا۔ اس کے علاوہ انگریز آفیسرز کو سیر و شکار کے لیے سرور نگر کی شکارگاہ جانے کی سہولت نہ تھی۔ چنانچہ اس پل کی تعمیر

میں خود مسٹر اسٹورٹ اور دیوان مہاراجہ چندو لعل بہادر نے بڑی دلچسپی لی۔ ایک سال کے اندر پل کی تعمیر کا کام ختم ہوا۔ پچھتر ہزار روپیہ کے صرفہ سے پل تعمیر ہوا جس کی پابجائی خزانہ عامرہ سے کی گئی۔

کسی وقت یہاں سنگ سیاہ کی تختی پر حیدرآباد کے شاعر مرزا غالب بیگ ظہور کی کہی ہوئی تاریخ بنائے پل کندہ اور نصب تھی۔ لیکن اب یہ کتبہ یہاں نہیں ہے۔

ناصرالدولہ شاہ آصف جاہ
کہ عدیلش کسے نہ دید نگاہ
حکم چوں شد براجہ چندو لعل
زود زد پل بہ شام و پگاہ
از سر عقل میجر اسٹورٹ
پل بنا کرد مثل مہر و ماہ

مادۂ تاریخ اس طرح ہے :- پل بنا کرد مثل مہر و ماہ = ۱۱۷۶

ع: ۷۰
۱۲۴۶ھ

یکم رمضان ۱۳۲۶ھ (۱۹۰۸ء) کی طغیانی میں اس پل کو سخت نقصان پہنچا۔ بجز دو کمانوں کے باقی تمام کمانیں ٹوٹ گیئں۔ سنہ ۱۳۲۸ھ اس پل کی ازسر نو تعمیر ہوئی۔ فٹ پاتھ اور لوہے کا کٹہرا بنایا گیا۔ اس جدید تعمیر کا خرچ دو لاکھ چالیس ہزار ایک سو دس روپیہ خزانہ عامرہ سے ادا ہوا۔

افضل گنج پل

نظام پنجم اعلحضرت مغفرت مکان نواب میر تہنیت علی خاں افضل الدولہ بہادر سنہ ۱۲۷۳ھ میں تخت نشین ہوئے۔ تخت نشینی کے دو سال بعد سنہ ۱۲۷۵ھ افضل گنج پل کی بنا پڑی رود موسیٰ پر یہ تیسرا پل ہے

جو چادر گھاٹ پُل کی تعمیر کے تقریباً ۸۰ سال بعد بنا۔ یہ پُل (۱۱) کمانوں پر قائم ہے۔ پُل کی تعمیر کے ساتھ شمالاً اور جنوباً دو خوبصورت دروازے تعمیر کئے گئے۔ شمال کی سمت کا دروازہ ۱۹۰۸ء کی طغیانی میں منہدم ہوگیا۔ جب پُل تعمیر ہوا تو اس وقت ریاست کے دیوان نواب سر سالار جنگ بہادر اول تھے اور ریذیڈنٹ کرنل ڈیوڈسن۔ ایک انگریز مسٹر مارٹ کی زیر نگرانی اس پُل کی تکمیل ہوئی۔ تکمیل پُل کی "تاریخ فرسودہ وجیہ اللہ خاں معنی (شاگرد حضرت فیضؒ) سنگ مرمر پر کندہ دروازہ کی سیدھی جانب نصب تھی۔

بعہد افضل الدولہ بہادر
نظام الملک آصف جاہ دوران
الٰہی تا بود تاباں مہ و مہر
بود خورشید اقبالش درخشاں
نکو دیوان او مختار الملک است
کہ نیکی را بود ہر سال خواہاں!
بود کرنیل ڈیوڈسن بہادر
سفیر نیک دل ذی شوکت و شاں
رحسن رائے مسٹر مارٹ این پُل!
بنا شد ہم چناں طاق ہفت ایواں
صراط مستقیم رود موسیٰ
ز معنیؔ مصرعہ تاریخ بر خواں

"صراط مستقیم رود موسیٰ" تاریخ تکمیل پُل ہے۔

یہ پُل افضل گنج بس اسٹانڈ سے شروع ہوکر جنوب میں پتھر گٹی کے ابتدائی سرے پر ختم ہوتا ہے۔ اس پُل کے خوب صورت دروازہ پر اعلیحضرت غفران مکان نواب میر محبوب علی خاں بہادر کی چہل سالہ جوبلی کی یادگار میں ایک بڑی گھڑی نصب کی گئی تھی۔

۲۲ رشوال ۱۳۲۳ھ [۲۳ ر ڈسمبر ۱۹۰۵ء] حسبِ پروگرام اعلیٰحضرت غفران مکان نے حضرت بابا شرف الدینؒ کی پہاڑی سے جلوس کے ساتھ خاصہ کی بگھی میں سوار باغ عام جاتے ہوئے مغرب کے وقت اس گھنٹہ گھر کا افتتاح فرمایا تھا۔ ۱۹۰۸ئہ کی تباہ کن طغیانی میں اس کی چند کمانیں ٹوٹ گئی تھیں۔ اور پُل کو سخت نقصان پہنچا۔ از سرِ نو اس کی تعمیر ہوئی۔ فٹ پاتھ بنائے گئے اور آہنی کٹہرا پُل کے دونوں طرف لگایا گیا۔ پولیس ایکشن ۱۹۴۸ء کے بعد آمد و رفت کی سہولت کے پیشِ نظر اس پل کی توسیع عمل میں آئی اور ٹرافک کی خاطر خوب صورت دروازہ زمین دوز کر دیا گیا۔

اعلیٰحضرت خلد مکان نواب میر عثمان علی خاں بہادر آصف سابع کے عہد زرین میں اس پُل کے شمال میں ایک طرف کتاب خانہ آصفیہ، [اسٹیٹ لائبریری] اور دواخانہ عثمانیہ اور جنوبی سمت عدالت العالیہ اور سٹی کالج جیسی عظیم الشان خوب صورت عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ اسی عہد میں رودِ موسیٰ کے شمالی کنارے ان بلند بالا عمارتوں کے آگے وسیع خوشنما چمن دلکش حوض اور فواروں سے آراستہ تعمیر ہوئے۔ آج بھی یہ چمن عوام کے لیئے فرحت بخش تفریح گاہ ہے۔ افضل گنج پل کو نیا پُل بھی کہتے ہیں۔ اس لیئے یہ چمن نئے پُل کے چمن سے مشہور ہے۔ چنانچہ اُستاد سخن صفی اورنگ آبادی اپنے ایک شعر میں اس چمن سے وابستہ ایک واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

صفی اپنے پُرانے واقعہ پر
نئے پُل کا چمن یاد آگیا ہے

لیکن آج یہ چمن زبانِ حال سے اس طرح گویا ہے۔

جو چمن خزاں سے اُجڑ گیا میں اسی کی فصلِ بہار ہوں
چمن اُڑ گیا آندھیاں آتے آتے ٹھیک ہی تو ہے۔

مُسلم جنگ پُل

مُسلم جنگ پُل رودِ موسیٰ پر پُرانے پُل اور افضل گنج پُل کے درمیان واقع ہے۔ شمالاً بیگم بازار سے شروع ہو کر جنوباً پیٹلہ برج کے ابتدائی کنارے پر ختم ہوتا ہے۔ جنوبی سمت ایک قدیم دروازہ چھپا دروازہ کے نام سے مشہور تھا۔ اس لیے اس پُل کو چھپا دروازہ کا پُل بھی کہا جاتا تھا۔ نواب مسلم جنگ نے رفاہ عام کی خاطر اس پُل کی تعمیر اپنے صرفہ سے کی تھی۔ اس لیے اِن کے نام سے مسلم جنگ پُل مشہور ہوا۔ مسلم جنگ سالم علی جمعدار عرب کا خطاب تھا۔ جن کا شمار ذی مرتبت جاگیرداروں اور جمعداروں میں ہوتا تھا۔ نواب افضل الدولہ بہادر نے انھیں یہ خطاب عطا کیا تھا اور اعلیٰحضرت غفران مکان نواب میر محبوب علیخان بہادر نے ان کو غالب جنگ غالب الملک اور لائق الدولہ کے خطابات سے سرفراز کیے تھے۔ انھیں شکار اور سفر شاہانہ میں اعلیٰحضرت غفران مکان کی ہمرکابی کا شرف ہمیشہ حاصل رہا۔ ۸ ربیع الاول سنہ ۱۳۲۳ھ بلدہ حیدرآباد میں نواب مسلم جنگ کا انتقال ہوا۔

صرف یہی پُل ایسا ہے کہ آج بھی پُل کے جنوب مغربی سمت تاریخ آغاز تیاری پُل سنگ مرمر کی تختی پر کندہ ہے (۹ ذیقعدہ ۱۳۱۱ھ) اور سنگ سیاہ پر تاریخ تکمیل پُل ۱۸ شوال ۱۳۱۸ھ اُبھرے ہوئے حروف میں موجود ہے۔ اس طرح چادر گھاٹ پُل کی تعمیر کے بہتر (۷۲) سال اور افضل گنج پُل کے بیالیس (۴۲) سال بعد مسلم جنگ پُل تعمیر ہوا۔ تکمیل پل کے بعد اس کا افتتاح اعلیٰ حضرت غفران مکان نے ۱۵ محرم سنہ ۱۳۱۹ھ کو بہ نفسِ نفیس پُل پر رونق افروز ہو کر کیا تھا۔

سید عبد القادر ہائی کورٹ کے ایک وکیل تھے۔ وہ شاعر بھی تھے

اور تخلص قانع تھا۔ آخر میں نواب سلم جنگ کے تمام کارخانہ جات و جاگیرات کے معتمد مقرر ہوئے۔ نواب سلم جنگ کے ہمراہ لندن کی سیاحت بھی کی تھی۔ پل کے اختتام پر سنگ مرمر کے کتبہ پر اِن ہی قانع کی کہی ہوئی تاریخ کندہ ہے

عہد میں حضرت آصف کے بنا
غالب الملک کا پل ہوسی پر
اس کی تاریخ کہی قانع نے
واہ کیا خوب عمارت بہتر

"عمارت بہتر" سنہ ۱۳۱۸ھ مادہ تاریخ تکمیل پل ہے۔
۱۹۰۸ء کی طغیانی میں اس کی سات کمانوں کو سخت نقصان پہنچا۔ طغیانی کے بعد جب جدید تعمیر ہوئی تو مزید دو کمانوں کا اضافہ کیا گیا۔ اب یہ پل دس کمانوں پر قایم ہے۔

مکہ مسجد میں آصف جاہی قبور

مکہ مسجد حیدرآباد دکن کی ایک عظیم الشان تاریخی مسجد ہے جس کے صحن میں داخل ہوتے ہی بائیں جانب ایک سنگ بستہ شاندار مقبرہ ہے۔ جہاں سلسلۂ وار شاہان آصفیہ کی قبریں ہیں اس کے علاوہ مسجد کے وسیع و عریض احاطہ میں محلات شاہی کی قبریں واقع ہیں۔ مورخین نے ان کے نام مع تاریخ وفات تو بتائے ہیں لیکن کس کی قبر کہاں بنا ہے اس کی نشان دہی سے قاصر رہے ہیں۔ تعجب اور افسوس کا مقام تو یہ ہے کہ نظامت امور مذہبی صرف خاص میں بھی جس کے زیر اہتمام ان مرحومین کا سالانہ فاتحہ اور ایصالِ ثواب کیا جاتا ہے یہ تفصیلات ندارد ہیں۔ تمام لوگ جو مکہ مسجد آتے جاتے رہتے ہیں وہ ان قبروں کی اہمیت و حرمت کیا جان سکتے ہیں۔

راقم السطور جن دنوں "سوانح عمری صفی اورنگ آبادی" کی تالیف کے سلسلہ میں مرحوم حضرت ابوالنصر محمد خالدی صاحب سابق استاد تاریخ اہلِ اسلام جامعہ عثمانیہ کی خدمت میں جایا کرتا تھا مذہب، تاریخ، شعر و ادب کی بہت سی باتیں معلوم ہوتی تھیں۔ حیدرآباد دکن ان کا وطن تھا اور شاہی دور دیکھا تھا اس لیے بھی انھیں آصف جاہی دور سے بڑی دلچسپی تھی۔ بڑی محققانہ نظر رکھتے تھے۔ تاریخ کی گم شدہ اور فراموش کردہ یادگاروں کی نشان دہی اس وثوق اور والہانہ انداز سے کرتے تھے کہ سننے والوں کے اندر تحقیق و تجسس کا داعیہ ایک شعلہ کی طرح بھڑک اُٹھتا تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اثنائے گفتگو احاطہ مکہ مسجد کے شمال و جنوب میں اِدھر اُدھر بنی ہوئی خانوادہ آصف جاہی کے قبور کا ذکر آگیا تو نام بنام کس کی قبر کہاں بنی ہے اس کا انکشاف کرتے ہوئے مجھ سے مزید تحقیق کرنے کو فرمایا۔ بات آئی گئی ہوگئی دیکھتے دیکھتے اس پر چھ سال گزر گئے ہیں اگرچہ دوسری مصروفیتوں میں اُلجھا رہا، لیکن بار بار دل میں یہ خیال آتا رہا کہ مولانا خالدی کی نشان دہی کی روشنی میں آگے قدم بڑھانا چاہیئے کہ مرورِ زمانہ سے اگر ان قبروں کے نشان مٹ بھی گئے تو کم از کم صفحۂ قرطاس پر تو محفوظ رہ سکیں گے۔

مکہ مسجد کی شمالی سمت میں

مکہ مسجد میں داخل ہوتے ہی جانب شمال

حضرت زینب النساء بیگم صاحبہ ایک قدیم پرانی وضع کا مگر خوبصورت گچ کا مقبرہ نمایاں ہے۔ مقبرہ کے درمیاں گچ کی بنی ہوئی زنانی قبر حضرت زینب النسا بیگم صاحبہ محل اولیٰ نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کی ہے۔ جو صوبہ دار برہان پور خوجم قلی خاں کی چھوٹی صاحبزادی تھیں جناب سراج الدین طالب اپنی تالیف "نظام علی خاں" جلد دوم میں رقم طراز ہیں:

"مراسم عقد کے بعد محلات میں داخل ہوئیں۔ ان کو بندگان عالی نے "برہان پوری بیگم" کا خطاب عنایت فرمایا تھا (ص ۶۶) صاحب "یادگار مکھن لال" نے زینب النساء بیگم صاحبہ کا سنہ وفات ۶ ربیع الاول ۱۲۳۸ھ لکھا ہے۔ شاہ کمتر حیدر آبادی نواب نظام علی خاں کے عہد میں موجود تھے انہوں نے نواب نظام علی خاں کی خادمہ "بواسوسن" کی فرمائش پر مثنوی "داستانِ نظام علی خاں" لکھی تھی۔ صاحبزادہ ڈاکٹر نجم الدین علی خاں نے سنہ ۱۹۷۸ء میں اس مثنوی کے مخطوطہ کو مطبوعہ کے مراحل میں داخل کیا۔ یہ مثنوی ایک مستند تاریخی ماخذ ہے۔ شاہ کمتر نے حضرت زینب النساء بیگم صاحبہ سے نواب نظام علی خاں کی شادی کا ذکر یوں کیا ہے:

وہ خورجم قلی خان بڑا تھا امیر
بہادر شجاع اور دانا کبیر
وہ بیٹی تھی چھوٹی پری کے مثال
نپٹ خوب صورت و صاحب کمال
وہ زینب النساء بیگم خوب رو
بنی وہ تو مثل پری ہو بہ ہو
رکھے ان سے نواب عشرت کے کام
برہان پوری بیگم رکھے اس کا نام

خجستہ بانو بیگم

مقبرہ زینب النساء بیگم صاحبہ سے ذرا آگے بجانب مغرب وسیع چبوترہ پر سنگ سیاہ کی پہلی زنانی قبر آصف جاہ اول کی صاحبزادی اور نواب نظام علی خاں کی خواہر خجستہ بانو بیگم صاحبہ کی ہے "مقدمہ تاریخ دکن" مولف عبدالمجید صدیقی صاحب نے خجستہ بانو بیگم صاحبہ کو آصف جاہ اول کی صاحبزادی بتایا ہے (ص ۹۰) لیکن مورخین نے مکہ مسجد میں مدفون اس شہزادی کا نام خجستہ بانو بیگم کی بجائے "خاں بہادر بیگم" ہی لکھا ہے۔ "صولت عثمانیہ" میں قاضی اسد اللہ قندھاری صاحب کا بیان

ہے کہ " یہ حضور نظام علی خان کی ہمشیرہ تھیں۔ آپ کی مردانہ طبیعت تھی کبھی زرہ بکتر پہن کر گھوڑے کی سواری کیا کرتی تھیں" (صفحہ ۹۰)

ممکن ہے اپنی اس مردانی وضع کے سبب وہ اس نام سے مشہور ہوئی ہوں۔

آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز میں فرامین مبارک بابتہ سنہ ۱۲۳۰ھ جلد (۱۴) میں ایک درخواست برائے ہجرت بجانب حافظ مقیم متعلقہ خجستہ" بانو بیگم واقع مکہ مسجد" موجود ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خجستہ بانو بیگم ہی اصل نام ہے مگر اب تو نہ مقبرہ ہے نہ چوکھنڈی۔

امامی بیگم

خجستہ بانو بیگم صاحبہ کی قبر سے کچھ فاصلہ پر مغربی جانب امامی بیگم صاحبہ دختر نواب نظام علی خاں کی قبر ہے۔ قبر پر بھی چوکھنڈی تھی جو اب نہیں ہے۔ قبر گچ کی بنی ہوئی ہے۔ امامی بیگم کا نام بحیثیت دختر نواب نظام علی خاں اور مکہ مسجد میں ان کی تدفین ہونے کا حوالہ کتب تواریخ اور مورخین کے مضامین میں ملتا ہے ملاحظہ ہو "اصول عثمانی" اور "آثر دکن"۔

مکہ مسجد میں جنوبی جانب گچ کا بنا ہوا ایک مستطیل مقبرہ نظر آتا ہے جس کے شمالاً جنوباً دروازے لگے ہوئے ہیں اور مقبرہ کی چاروں دیواروں میں خوبصورت جالیاں لگی ہوئی ہیں اور چھت کے اوپر چھوٹے آٹھ مینار نمایاں ہیں۔ مقبرہ میں فرش سنگ سیلو کا ہے جب کہ درمیان میں سفید سنگ مرمر کی بنی خوبصورت پانچ زنانی قبریں موجود ہیں ان قبروں پر کوئی لوح مزار نہیں ہے لیکن جن کی قبریں ہیں ان کے نام اور تاریخ وفات حسب ذیل ہیں :-

حضرت تہنیت النساء بیگم صاحبہ :

مقبرہ میں انتہائی مغرب میں پہلی قبر حضرت تہنیت النساء بیگم صاحبہ

عرف بی بی صاحبہ محل نواب نظام علی خاں اور حقیقی والدہ نواب سکندر جاہ کی ہے۔ تاریخ رشید الدین خانی میں لکھا ہے کہ "اسی سال (۱۲۲۷ھ) تیسویں جمادی الآخر میں نہنیت النساء بیگم صاحبہ حقیقی والدہ نواب سکندر جاہ داخل بہشت بریں ہوئیں۔ (ص ۳۳۹)

اس سلسلہ کی دوسری قبر حضرت

حضرت فضیلت النساء بیگم صاحبہ

فضیلت النساء بیگم صاحبہ کی ہے جن کا نام چاندنی بیگم اور خدیجہ بیگم بھی تھا۔ حضرت فضیلت النساء بیگم صاحبہ نواب سکندر جاہ کی محل اور نواب ناصر الدولہ کی حقیقی والدہ تھیں۔ صاحب رشید الدین خانی نے بتایا ہے کہ آٹھویں ربیع الاول سنہ ۱۲۴۹ھ بارسو انچاس میں فضیلت النساء بیگم صاحبہ مکرمہ حقیقی والدہ ماجدہ حضور عالی راہی عالم بقا ہوئیں۔ (ص ۳۵۸)

حضرت بخشی بیگم صاحبہ

حضرت بخشی بیگم صاحبہ نواب نظام علی خاں کی محل تھیں شاہ کمتر نے بخشی بیگم صاحبہ کی مدح میں یوں لکھا ہے:

جو بیگم ہے ان کی پری کے مثال
سو وہ بخشی بیگم ہے صاحب جمال

سو زن زرینہ سے سب بیگمات
خصوصاً وہ بیگم جو ہے نیک ذات

سو وہ بخشی بیگم بڑی سان کے
نپٹ خوبصورت بہوت شان کے

بموجب "تاریخ رشید الدین خانی" ۱۲۲۸ھ بارسو اٹھائیس تاریخ ذی الحجہ کی بخشی بیگم صاحبہ بڑی والدہ حضور کی تشریف فرمائے روضۂ جاودانی ہوئیں (ص ۳۲۶) انتقال کے وقت عمر ستر سال تھی۔ صاحب نگارستان آصفی لکھتے ہیں "بوقت انتقال وصیت کی کہ انھیں پائین نواب نظام علیخاں دفن کیا جائے۔ اسی وصیت پر عمل کیا گیا"۔ (ترجمہ فارسی ص ۱۹)

بخشی بیگم صاحبہ کی پہلی قبر ہے جو اس مقبرہ میں بنی۔ سنہ وفات سے یہ ظاہر اور واضح ہے۔

حضرت دلاور النساء بیگم صاحبہ

حضرت بخشی بیگم صاحبہ کی قبر کے بائیں بجانب مشرق حضرت دلاور النساء بیگم کا مدفن ہے۔ حضرت دلاور النساء بیگم صاحبہ نواب ناصر الدولہ کی محل، نواب افضل الدولہ کی حقیقی والدہ مکرمہ اور غفران مکان نواب میر محبوب علیخاں کی جدہ محترمہ تھیں ستر سال کی عمر میں ۷ ذی الحجہ ۱۳۰۵ھ (تیرہ سو پانچ) راہی ملک عدم ہوئیں۔ اعلیٰ حضرت غفران مکان نواب میر محبوب علی خاں کی کمسنی میں ان کی دیکھ بھال اور تعلیم و تربیت میں دلاور النساء بیگم صاحبہ کا خاصہ حصہ رہا اور جب وہ تخت نشین ہوئے تو انتظامی امور سلطنت میں رہنمائی کی۔

تمام تاریخوں میں آتا ہے کہ بڑی نیک دل، صاحب خیر اور عابدہ و زاہدہ خاتون تھیں کئی مکانات تمام آرام و آسائش سے آراستہ حرمین شریفین (زادھا اللہ شرفاً و تعظیماً) میں وقف کیے تھے۔ چنانچہ آپ کی تعمیر کردہ تین منزلہ رباط مکہ معظمہ میں حرم سے بہت قریب سنہ ۱۹۸۰ء تک موجود تھی۔ رباط کے باب الداخلہ پر چکنے پتھر کی تختی چسپاں تھی جس پر موٹے سیاہ حروف میں "رباط دلاور النساء بیگم" کندہ تھا اور سنہ تعمیر ۱۲۹۳ھ (بارہ سو ترانوے ہجری) بھی لکھا ہوا تھا۔ رباط بوسیدہ ہوجانے سے اسے منہدم کرکے اس جگہ نواب مکرم جاہ بہادر نے سنہ ۱۹۸۱ء میں دو منزلہ رباط، "رباطِ حیدرآباد" کے نام سے تعمیر فرمائی۔ حاجیوں اور زائرین کو مفت ٹھہرنے اور ہر ممکن آرام و سہولت پہونچانے کی حضرت دلاور النساء بیگم صاحبہ جیسی صاحبِ خیر ملکہ کی روایت آج بھی "رباطِ حیدرآباد" میں اور بھی بہتر طور سے جاری و برقرار ہے جو دلاور النساء بیگم صاحبہ مرحومہ جیسی نیک دل ملکہ دکن کی یاد دلاتی ہے۔ قدیم سے آج بھی ہر سال باقاعدہ

حضرت دلاور النساء بیگم صاحبہ کے مزار پر فاتحہ خوانی ہوتی ہے عرس ہوتا ہے اور چادر گل چڑھائی جاتی ہے۔

حضرت واحد النساء بیگم صاحبہ جناب خالدی صاحب کی نشان دہی کے بموجب اس مقبرہ کی آخری مشرقی سمت کی قبر حضرت واحد النساء بیگم صاحبہ کی ہے جن کا انتقال ۷ر شعبان سنہ ۱۳۳۷ھ یکشنبہ درمیانی شب میں ہوا۔ صبح پانچ بجے مکہ مسجد میں تدفین ہوئی۔ واحد النساء بیگم صاحبہ آعلیٰ حضرت مغفرت مکان نواب افضل الدولہ کی محل، آعلیٰ حضرت غفران مکان نواب میر محبوب علیخاں کی حقیقی والدہ اور اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علی خاں کی جدہ محترمہ تھیں۔

جنوبی سمت کی چھ قبور

جنوبی مقبرہ کے باہر اس کی مشرقی دیوار سے ملحق ایک فٹ اونچے سنگ سیلو کے چبوترہ پر سلسلہ وار ایک وضع کی چھ سنگ مرمر کی زنانی قبریں بغیر کسی سایہ بان نظر آتی ہیں۔ مکہ مسجد میں صرف یہی قبریں شاہی بیگمات اور شاہزادیوں کی ہیں۔ جن کی قبر کی تعویذ کے سرہانے سنگ مرمر کی چھوٹی سی تختی پر نام اور پائین کی تختی پر سنہ وفات اور رشتہ قرابت کندہ ہے قبروں کی ترتیب مغرب سے مشرق کی سمت حسب ذیل ہے:

(۱) حضرت اُجالا بیگم صاحبہ محل غفران مکان علیہ رحمتہ تاریخ وفات ۱ر اکتوبر ۱۹۴۵ء (۲) حضرت سردار بیگم صاحبہ محل حضرت غفران مکان تاریخ وفات ۱۱ر اگست ۱۹۵۰ء (۳) غوث النساء بیگم صاحبہ۔ صاحبزادی مرحوم سرکار محل فرید نواز جنگ فرزند سلطان الملک مرحوم تاریخ وفات ۳۰ر نومبر ۱۹۵۵ء (۴) داور النسا بیگم صاحبہ صاحبزادی مرحوم سرکار۔ محل نذیر نواز جنگ فرزند سلطان الملک مرحوم تاریخ وفات ۲۱ر جون ۱۹۶۱ء (۵) آصف النسا بیگم صاحبہ صاحبزادی مرحوم سرکار محل مظفر نواز جنگ مرحوم تاریخ وفات ۲۶ ڈسمبر ۱۹۶۵ء (۶) عمدہ بیگم صاحبہ محل غفران مکان تاریخ وفات یکم جون ۱۹۶۹ء

نواب میر محبوب علی خاں کی بیوہ محل تھیں جن کا انتقال حضور نظام نواب میر عثمان علی خاں کی وفات (۱۹۶۷ء) کے دو سال بعد ہوا۔

جنوبی سمت کی آخری دو قبریں

متذکرہ چبوترہ کے پائین میں دو قبریں ایک دوسرے سے ذرا فاصلہ پر بنی ہوئی ہیں جن پر کوئی کتبہ نہیں۔ ان پر جو کھنڈی بنی ہوئی ہونے کا حوالہ کتب تواریخ میں ملتا ہے۔

بوا سوسن سنگ سیاہ کی زنانی قبر "بوبو" نواب نظام علی خاں کی ہے بوبو سوسن نظام علی خاں کی نہایت عقیدت مند، قابلِ اعتبار خادمہ تھی شاہ کمتر نے اس خاتون کی فرمائش اور امید انعام میں مثنوی "داستانِ نظام علی خاں" یوں لکھی تھی چنانچہ بوبو سوسن کی تعریف میں کمتر یوں رطب اللسان ہیں:

جو ہے بوبو سوسن وہ صاحب تمیز!
وہ ہوشیار و دانا دہر دل عزیز
نظام علی خاں پہ تھی جان نثار
وہ نواب بھی اس پہ رکھتے تھے پیار
مبارک اسے بوبو سوسن ہے نام!
محبت ستے ان کا کرتی تھی کام!

میاں نیک روز خان بوبو سوسن کی قبر کے مشرقی جانب میاں نیک روز خان خواجہ سرا نواب نظام علی خان کی قبر ہے۔ میاں نیک روز خاں کے مکہ مسجد میں مدفون ہونے کا ذکر تاریخوں میں ملتا ہے۔ دکن کے مورخ و محقق جناب معین الدین رہبر صاحب فاروقی نے اپنے محققانہ مضمون "مکہ مسجد کی تاریخی عظمت" (سب رس ستمبر ۱۹۴۷ء)

میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ صاحب "صولت عثمانی" سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے
"ان کی قبر پائیں فرش ہے۔ یہ نواب نظام علی خان کا خواجہ سرا اور حضور ممدوح
کا مورد عنایت تھا۔" [صفحہ ۹]

خانوادہ آصفیہ کے اس شاہی قبرستان میں جہاں شاہان آصفیہ، ان کے محلات اور شہزادے شہزادیاں آسودۂ خواب ہیں وہاں ان کے بعض خدام کی قبروں کو دیکھ کر یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ ان بادشاہوں نے ملازمین بارگاہ کے وفادارانہ خدمات اور ان کی جان نثاری کی اس درجہ قدر کی کہ مرنے کے بعد بھی ان کی رفاقت کو یوں ملحوظ رکھا کہ آج ان کی قبروں کے برابر ان نمک خواروں کی قبریں بنی ہوئی ہیں۔

ان مرحومین کے سالانہ ایصالِ ثواب کا بجانب پرائیوٹ اسٹیٹ حضور نظام (صیغۂ امور مذہبی) اہتمام کیا جاتا ہے تو اب یہ بہت ضروری ہے کہ ان شاہی قبروں کی کما حقہ حفاظت و نگہداشت کا بھی انتظام ہو۔

آخر میں دودمان آصفی کے چشم و چراغ اعلیٰ حضرت حضور نواب مکرم جاہ بہادر آصف جاہ ثامن اور شہزادہ نواب مفخم جاہ بہادر کی خدمت میں بڑے ادب سے معروضہ کرتا ہوں کہ ان تمام قبروں پر لوح مزار کی تنصیب کا انتظام فرمائیں تاکہ صاحب مزار کے متعلق کوئی جاننا چاہے تو ان کا نام سنہ وفات وغیرہ کی تفصیلات معلوم ہوں۔

مکہ مسجد میں مقبرۂ سلاطین آصفیہ

سرزمین ہندوستان میں بادشاہوں کے مقبرے اور گنبد جگہ جگہ موجود اور نمایاں ہیں۔ سلاطین مغلیہ کے خوبصورت گنبد شہر دلی، آگرہ اور لاہور کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ دکن میں سلاطین بہمنیہ، بریدشاہیہ، عادل شاہیہ اور قطب شاہیہ کے بلند سے بلند تر عجیب الشان گنبد گلبرگہ، بیدر، بیجاپور اور

گولکنڈہ میں سیاحوں کے لیے وجہ کشش ہیں۔ جیساکہ اس زمانہ میں رواج تھا ان بادشاہوں نے اپنی زندگی ہی میں اپنے اپنے گنبد تعمیر کرائے لیکن غور طلب بات ہے کہ سلاطین آصفیہ نے دکن میں تقریباً دو سو سال بڑی شان و شوکت سے حکمرانی کی مگر ان میں سے کسی بادشاہ یا ان کے جانشین نے اپنے لئے کوئی گنبد تعمیر نہیں کیا۔ اس کی وجہ ہم غور کریں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہ بادشاہ دولت وجاہ و اقبال میں کتنا ہی بلند مقام رکھتے ہوں لیکن فطرتاً بڑے فقیر منش تھے اور جانتے تھے کہ ایک دن سب کچھ چھوڑ کے اس دنیا سے جانا ہے۔ انھوں نے یہاں اپنی زندگی میں کیسی کیسی عالی شان حویلیاں بنوائیں بڑے بڑے خوب صورت جنت نشان محل تعمیر کئے۔ چاہتے تو کسی وسیع و عریض خطہ پر اپنے لیے عالی شان و بے مثال گنبد بناتے جو فن تعمیر کا حسین ترین مرقع ہوتے لیکن انھوں نے اپنی آخری آرامگاہ کے لیے مسجد کا انتخاب کیا کہ کوئی اللہ کا نمازی بندہ ان کی یہ بیکسی دیکھ کر کہ:

کل جو رکھتے تھے اپنے فرق پہ تاج!
آج ہیں فاتحہ کو وہ محتاج!

اللہ کے حضور ان کے لیے دعائے مغفرت تو کرے گا۔

حکومت آصفیہ کے پہلے حکمران نواب آصف جاہ اول کا مزار خلد آباد (اورنگ آباد) میں درگاہ حضرت برہان الدین غریبؒ کے مغربی جانب ہے جس پر کوئی گنبد نہیں البتہ سرخ سنگ مرمر کی جو کھنڈی بنی ہوئی ہے اور نام کا کتبہ بھی موجود ہے۔ اس طرح خانوادہ آصفیہ کے دوسرے بادشاہ نواب ناصر جنگ شہید (میر احمد خاں) کا مزار بھی اسی درگاہ کے جنوب میں واقع ہے جس پر جو کھنڈی بھی ہے اور کتبہ بھی۔ نواب مظفر جنگ (ہدایت محی الدین خاں) تیسرے بادشاہ نواب آصف جاہ اول کے نواسے تھے جو صرف دو ماہ تخت آصفیہ پر متمکن رہے اور ان کے قتل ہونے کے بعد تاریخ بس اتنی رہبری کرتی ہے کہ ان کے اقربا ان کا جنازہ بیجاپور کی طرف لے گئے۔

لیکن ان کی قبر کہاں ہے اس کا حوالہ تاریخ میں نہیں ملتا۔ مغفرت مآب نواب آصف جاہ اول کے فرزند میر محمد خاں صلابت جنگ سلسلۂ آصفیہ کے چوتھے بادشاہ تھے۔ انھوں نے مملکت آصفیہ پر [۱۳] سال حکومت کی آخر کار ان کے بھائی غفران مآب نواب نظام علی خاں نے ان کو معزول کر کے قلعہ بیدر میں قید کر دیا۔ انتقال کے بعد ان کی تدفین بیدر میں حضرت شمس الدین ملتانی کی درگاہ کے جوار میں ہوئی۔ یہ بڑی عبرت کا مقام ہے کہ نواب صلابت جنگ کی قبر بڑی گمنام حالت میں ہے۔ جس پر نہ گنبد ہے نہ چوکھنڈی اور نہ کوئی کتبہ۔

آخری بادشاہ دکن اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علی خان کی آخری آرامگاہ ان کی وصیت کے مطابق مسجد جودی (محاذی کنگ کوٹھی) میں ان کی والدہ مرحومہ کے پہلو میں بنی۔ قبر پر نام اور تاریخ وفات کندہ ہے۔ سقوط حیدرآباد سنہ ۱۹۴۸ء کے بعد حضور نظام کو تخت و حکومت سے دست بردار ہونا پڑا تھا اور وہ بادشاہ نہیں رہے تھے۔ اس لیئے آپ نے مکہ مسجد کے شاہی مقبرہ میں شاہان سلف کی صف اپنی تدفین مناسب نہیں سمجھی۔ الغرض سلسلۂ آصفیہ کے محدود ے چند حکمرانوں کے سوا جن کی قبریں مختلف مقامات پر پائی جاتی ہیں پانچ بادشاہ اسی ایک سنگ بستہ شاہی مقبرہ میں پہلو بہ پہلو ابدی نیند سو رہے ہیں۔

جب غفران مآب نواب نظام علی خان آصف جاہ ثانی کی والدۂ محترمہ حضرت عمدہ بیگم صاحبہ کا انتقال سنہ ۱۱۸۸ھ میں بمقام حیدرآباد ہوا تو ان کی تدفین مکہ مسجد میں اسی جگہ ہوئی جہاں یہ مقبرہ بنا ہوا ہے خانوادۂ آصفیہ کی یہ پہلی خاتون تھیں جن کی تدفین سب سے پہلے مکہ مسجد میں ہوئی۔ ان کے بعد ہی سلاطین آصفیہ، ان کی بعض بیگمات، شہزادوں، اور شہزادیوں کی تدفین یہاں ہونے لگی چنانچہ مکہ مسجد میں شمالاً اور جنوباً شاہی افراد خاندان کی قبریں موجود ہیں۔

متذکرہ مقبرہ سلاطین کی تعمیر سے قبل ان قبروں پر سنگ مرمر کی خوبصورت
چوکھنڈیاں ماہر کاریگروں کی بنائی ہوئی تھیں جن کے اطراف سنگ مرمر کی
جالیاں نقش و نگار سے آراستہ، گل بوٹوں سے پیراستہ فن سنگ تراشی
کا اعلیٰ نمونہ تھیں[۱]۔ بادشاہوں کے مقبروں پر نام اور تاریخ وفات کے کتبے
بڑے دیدہ زیب اور نفیس خط میں کندہ تھے قبروں کے اوپر کوئی عمارت
نہ تھی۔ صرف مولسری کے اونچے اور گھنے درخت ان پر سایہ فگن رہتے تھے۔

جب اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علی خاں سربر آرائے سلطنت ہوئے
تو رفاہی اور تعمیری کاموں کا آغاز ہوا۔ چنانچہ مکہ مسجد میں قبور سلاطین پر
مقبرہ تعمیر کرنے ۲۲ جمادی الاخریٰ سنہ ۱۳۳۴ھ حکم دیا[۲]۔ اس حکم کی تعمیل
میں مکہ مسجد کے شایان شان تراشیدہ پتھر کے اس مقبرہ کی تعمیر اس خوبی سے
ہوئی کہ یہ بھی گویا مکہ مسجد ہی کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے جو عہد قطب شاہی
میں تعمیر ہوئی تھی۔ جب یہ مقبرہ تعمیر ہونے لگا تو شاہی قبور سے سنگ مرمر کی
چوکھنڈیاں اور کتبے نکال دیئے گئے اور ایک فٹ اونچا سفید سنگ مرمر
کا مستطیل چبوترہ تعمیر کیا گیا جس پر قطار اندر قطار مغرب سے مشرق سنگ
مرمر کی قبریں بنی ہوئی ہیں جن پر گل کاری کی گئی ہے لیکن کسی قبر پر نام کا کتبہ نہ
ہونے سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کس کی قبر ہے۔ البتہ ہر جمعہ کو قبروں پر زرد
رنگ کا غلاف ڈالا جاتا ہے اور ایک فریم میں نام اور تاریخ وفات لکھی ہوئی
موجود رہتی ہے نام کا کتبہ نہ ہونے سے عوام تو کجا خود تاریخ نگاروں
نے نشان دہی کرنے میں سخت غلطیاں کی ہیں۔ اعلیٰ حضرت غفران مکان
نواب میر محبوب علی خاں کی تدفین ان کے دادا اعلیٰ حضرت غفران منزل
نواب ناصر الدولہ کے پہلو میں ہوئی لیکن صاحب بستان آصفیہ نے جلد پنجم

۱۔ آثار حیدرآباد دکن مصنف سید ہاشم علی مظاہر بیرسٹر ۲۔ فرمان فائل قسط (۸)
مراسلہ نشان (۲۴۳) کوٹھ (۳۰) آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیف۔

صفحہ ۲۹۹، مسٹر مدیراج نے اپنی تالیف "پکٹوریل حیدرآباد" جلد اول صفحہ ۸۲ اور "مملکت آصفیہ" جلد اول صفحہ ۱۶۸ (مطبوعہ پاکستان) میں ان کی تدفین ان کے والد اعلیٰ حضرت مغفرت مکان نواب افضل الدولہ کے پہلو میں بتائی ہے حالانکہ محققین کے مضامین کی روشنی میں یہ صحیح نہیں ہے اس لیے اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ دفتر ناظم امور مذہبی صرف خاص ٹرسٹ ایچ۔ای۔ایچ دی نظام کی جانب سے جس کے ذمہ اس مقبرہ کی صفائی و نگرانی ہے ان مزاروں پر ناموں کے کتبے لگائے جائیں۔

آئیے اب اس مقبرہ شاہی کو دیکھیں:

اعلیٰ حضرت مغفرت مکان
نواب افضل الدولہ بہادر

سلاطین کے اس مقبرہ میں انتہائی مغرب پہلی قبر نواب میر تہنیت علی خان نواب افضل الدولہ مغفرت مکان کی ہے۔ نواب افضل الدولہ ۲۹ ربیع الآخر سنہ ۱۲۴۲ھ "حویلی قدیم" حیدرآباد دکن میں تولد ہوئے اور اپنے والد نواب ناصر الدولہ کی وفات کے بعد ۲۴ رمضان سنہ ۱۲۷۳ھ (۱۸۵۷ء) تخت نشین ہوئے۔ بارہ سال ایک ماہ بیس دن حکومت کرنے کے بعد سات دن بیمار رہ کر جمعہ ۱۳ ذیقعدہ سنہ ۱۲۸۵ھ (۲۶ فروری ۱۸۶۹ء) بعمر بیالیس سال راہی ملک بقا ہوئے۔ ہر جمعہ قبر پر رکھے جانے والے فریم میں تاریخ وفات ۱۴ ذیقعدہ درج ہے جو قابل اصلاح ہے۔ نواب افضل الدولہ کے مقبرہ پر جناب علی عباس ادیب چریاکوٹی کی کہی ہوئی تاریخ وفات کندہ تھی:

الی المالک تاج الجنتہ — ولمہد وحی فاح الجنتہ
قلت تاریخ وفات المرحوم — افضل الدولہ راح الجنتہ

۱۲۸۵ھ — (صولت عثمانی ص ۸۵)

نواب افضل الدولہ بہت نیک دل اور صاحب خیر بادشاہ تھے۔ رعایا کی بھلائی کے لیے کئی رفاہ عام کے کام کئے۔ دواخانے، پل، سرائیں اور مسجدیں وغیرہ

وغیرہ تعمیر کیں۔ حیدر آباد میں پہلی مرتبہ ایک بڑا دوا خانہ، دوا خانہ افضل گنج کے نام سے تعمیر ہوا جہاں مریضوں کا علاج مفت ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں زائرین اور حاجیوں کے لیے شاندار رباطیں بنوائیں جو رباط افضل الدولہ کے نام سے مشہور تھیں جن میں آرام و آسایش کے ساتھ مفت ٹھہرنے اور مفت طبی سہولت کا معقول انتظام تھا۔

مغفرت مکان نواب افضل الدولہ کو "مولود شریف" کا بڑا والہانہ ذوق تھا۔ مولود خوانوں کی جماعتیں سرکار میں ملازم تھیں۔ ادب و احترام کا یہ حال تھا کہ کبھی سوتے ہیں رات کے وقت مولود خوانی کی آواز دُور سے بھی سن لیتے تو اٹھ بیٹھتے۔ خدام بارگاہ دست بستہ آرام کرنے کا معروضہ کرتے تو فرطِ عقیدت سے فرماتے کہ پاؤں کیسے لمبے کردوں بے ادبی ہوگی۔ معلوم نہیں مولود خوانی کس طرف ہورہی ہے! نواب افضل الدولہ کے اس جذبۂ عقیدت کے احترام میں آج بھی مکہ مسجد میں بعد نماز جمعہ صرف افضل الدولہ کے مزار پر پابندی سے مولود خوانی ہوتی ہے اور بکثرت لوگ حلقہ باندھے سر جھکائے با ادب کھڑے سُنتے ہیں۔

اعلیٰ حضرت مغفرت منزل نواب سکندر جاہ بہادر مقبرہ کے مغرب سے مشرق کی طرف دوسری قبر اعلیٰ حضرت مغفرت منزل نواب میر اکبر علیخاں سکندر جاہ بہادر کی ہے۔ نواب سکندر جاہ سنہ ۱۱۸۱ھ تولد ہوئے۔ اپنے والد نواب نظام علیخان آصف جاہ ثانی کے بعد ۱۷ ذیقعدہ سنہ ۱۲۱۸ھ وارث تخت و تاج ہوئے چھبیس ۲۶ سال حکومت کی۔ دو برس مرض استسقاء میں مبتلا رہ کر ستاون (۵۷) سال کی عمر میں روز جمعہ سنہ ۱۲۴۴ھ وفات پائی۔

نواب سکندر جاہ کے مقبرہ کے شمالی دروازہ کے اوپر حسب ذیل اشعار کندہ تھے:

بود شاہ دکن سکندر جاہ   در سلاطین ہند بے ہمتا

عادل و باذل و شجیع و جری — معدن خلق و کان علم و حیا
چون بہ گلگشت باغ جنت رفت — داغ حسرت گذاشت بر دلہا
شدہ در ماتمش جہان تاریک — پُر شد از غم ز ارض تا بہ سما
آمدش از سر الم تاریخ — آہ رفت آفتاب از دنیا

مزار کے کتبہ پر تاریخ وفات:

چون سکندر جاہ از آفات رفت ٭ ہر مکان شد از غمش بیت الحزن
برکشیدم آہ و گفتم سال او ٭ راہی فردوس شد شاہ دکن!
۱۲۴۴ھ

یہ شعر بھی کندہ تھا:

کرد شاہ دکن ز دہر کنار ٭ یک ہزار و دو صد و چہل و چہار

شہزادی یاورالنساء بیگم صاحبہ

اس سلسلہ کی تیسری قبر شاہزادی یاورالنساء بیگم صاحبہ کی ہے۔ قبر پر رکھے جانے والے فریم میں صرف "مزار صاحبزادی یاورالنساء بیگم" لکھا ہوا ہے لیکن یہ کس کی صاحبزادی تھیں اور تاریخ وفات کیا ہے اس کا اندراج نہیں دراصل شہزادی صاحبہ اعلیٰحضرت نواب میر عثمان علی خاں کی سب سے بڑی صاحبزادی تھیں جن کی تاریخ ولادت ۲۵ر رمضان سنہ ۱۳۲۶ھ اور تاریخ انتقال چہارشنبہ ۳ر جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۳۴ھ[1] ہے۔

شہزادی نظام النساء بیگم صاحبہ

اس سلسلہ کی چوتھی قبر شہزادی نظام النساء بیگم صاحبہ کی ہے۔ فریم میں "مزار نظام النسا بیگم صاحبزادی غفران مکان علیہ رحمۃ" کا اندراج تو موجود ہے لیکن تاریخ وفات موجود نہیں ہے۔ شہزادی مرحومہ اعلیٰ حضرت غفران مکان نواب میر محبوب علیخاں کی سب سے بڑی اور عزیز ترین شہزادی تھیں جو ان کی محل حضرت چاندنی بیگم صاحبہ

---

[1] جریدہ غیر معمولی ۱۴ر اردی بہشت ۱۳۲۵ف ۲ر جمادی الاولیٰ ۱۳۳۴ھ چہارشنبہ

کے بطن سے ۳ر شوال سنہ ۱۳۰۰ھ کو پیدا ہوئیں اور تئیس ۲۳ سال کی عمر میں کہ ہنوز اَن بیاہی تھیں داغ مفارقت دے گئیں۔ ان کے المناک یوم وفات[1] کی دیرینہ یادگار وکٹوریہ زنانہ اسپتال کی رفیع الشان عمارت سے یوں وابستہ ہے کہ اس کا سنگ بنیاد اسی روز غم و اندوہ کی فضاء میں پرنسس میری آف ویلز کے ہاتھوں رکھا گیا تھا۔ کسی وقت شاہزادی کی قبر پر سنگ مرمر کا مقبرہ موجود تھا[2] لیکن نام اور تاریخ وفات کا کوئی کتبہ کندہ نہ تھا۔

شہزادی ہدایت النساء بیگم صاحبہ

یہ شہزادی کون تھیں اور تاریخ وفات کیا تھی یہ تو درج نہیں صرف مزار صاحبزادی ہدایت النساء بیگم "فریم میں لکھا ہوا ہے۔ دراصل شہزادی ہدایت النساء بیگم عرف منجھلی صاحبزادی حضور نظام نواب میر عثمان علیخان کی عزیز ترین شہزادی تھیں جن کی ولادت ۸ ربیع الاول سنہ ۱۳۲۷ھ میں ہوئی اور وفات ۲۹ ربیع الاول سنہ ۱۳۴۴ھ شب[1] دوشنبہ کو ہوئی۔ بعد نماز ظہر مکہ مسجد میں حضرت جماعت علی صاحبؒ نے نماز جنازہ پڑھائی۔ اس مقبرہ میں یہ ایک ہی قبر ہے جس کے اوپر درمیان میں "اورثت جنتہ النعیمہ" کندہ ہے۔
۱۳۳۵ف

حضرت عمدہ بیگم صاحبہ

حضرت عمدہ بیگم صاحبہ مغفرت مآب نواب آصف جاہ اول کی محل اور نواب نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کی حقیقی والدہ ماجدہ تھیں۔ آپ کا انتقال حیدرآباد میں ۲۰ ذی الحجہ سنہ ۱۱۸۸ھ میں ہوا۔ ان دنوں نواب نظام علی خاں حیدرآباد سے باہر جنگ میں مصروف تھے۔ صاحب "صولت عثمانی" لکھتے ہیں حمد و حد کے انتقال کے بعد ارسطو جاہ مدار المہام اور امرائے دولت نے صحن مکہ مسجد میں دفن کے لیے جگہ تجویز کی۔۔

---

[1] جریدہ غیر معمولی جلد (۴۷) مورخہ ۱۰ر فروری ۱۳۱۵ف م ۵ ذی الحجہ ۱۳۲۳ھ
[2] آثار صنادید دکن مصنفہ سید ہمایوں مرزا بیرسٹر
[1] جریدہ غیر معمولی جلد (۵۷) ۱۴ آذر ماہ ۱۳۳۵ف م ۲۰ ربیع الاول ۱۳۴۴ھ

یہ صحن مکہ مسجد کی پہلی قبر ہے" [ص ۸۹] نواب نظام علی خاں بعد اختتام جنگ سنہ ۱۱۹۰ھ مراجعت فرمائے حیدر آباد ہوئے اور اپنی والدہ ماجدہ کے مراسم زیارت بجا لائے۔

شہزادی مسرّت النساء بیگم صاحبہ اس قبر پر رکھے جانے والے فریم میں "مزار شہزادی مسرّت النساء بیگم" لکھا ہوا ہے۔ شہزادی مرحومہ حضور نظام نواب میر عثمان علیخان کی صاحبزادی تھیں۔ راقم الحروف کو ان کی تاریخ وفات معلوم نہ ہوسکی۔ زیر تحقیق ہے۔

شہزادہ نواب میر غلام عبدالقادر علیخان غفران مکان نواب میر محبوب علیخان کے فرزند شہزادہ میر غلام عبدالقادر علیخان حضرت سردار بیگم صاحبہ کے بطن سے بمقام محل لنگم پلی روز پنجشنبہ ۲ رمضان سنہ ۱۳۱۲ھ تولد ہوئے اور ایک سال بعد ۸ رمضان سنہ ۱۳۱۳ھ یکشنبہ گیارہ بجے شب بمقام کوہِ مولا" انتقال کیا۔ ۹ بجے صبح ۹ رمضان سنہ الیہ مکہ مسجد کے شاہی مقبرہ میں تدفین ہوئی۔ اس شہزادہ کی پیدایش کی تہنیت میں مہاراجہ کشن پرشاد شاد مدارالمہام نے ایک قصیدہ بارگاہ سلطانی میں گذرانا تھا۔ یہ قصیدہ ایک کتابچہ کی صورت میں "ارمغان زیبائے نذر سلطان" کے عنوان سے ۱۳۱۲ھ میں شائع بھی ہوا تھا۔ قصیدہ میں شہزادے کا نام میر غلام عبدالقادر علی خان ہی لکھا ہوا ہے۔ اس لحاظ سے قبر پر رکھے جانے والے فریم میں نام "میر قادر علیخان" اور تاریخ وفات سنہ ۱۳۱۱ھ قابلِ اصلاح ہے۔ مورخین نے بھی بغیر تحقیق نام غلط لکھا ہے۔ اس قبر پر کسی وقت سنگِ مرمر کا مقبرہ بنا ہوا تھا [ملاحظہ ہو آثار ضا دید دکن]

غفران مآب نواب نظام علیخان غفران مآب نواب نظام علی خان آصف جاہ ثانی مغفرت مآب نواب آصف جاہ اول کے چوتھے صاحبزادے تھے جو غرۂ شوال سنہ ۱۱۴۶ھ تولد ہوئے اور سنہ ۱۱۷۵ھ تخت آصف جاہی پر متمکن ہوئے۔ تینتالیس ۴۳ سال حکومت کرنے کے بعد تین ۳ سال مرض فالج میں صاحبِ فراش رہ کر بعمر تہتر سال ۷ ربیع الآخر

سنہ ۱۲۱۸ھ دنیا سے رخصت ہوئے نواب نظام علی خان کی محل حضرت بخشی بیگم صاحبہ کو آپ سے بڑی عقیدت اور محبت تھی۔ اس بناء پر نواب نظام علیخان کی قبر اور مقبرہ انھوں نے اپنے صرفہ سے بنوایا چنانچہ اس دور کے شاعر شاہ کمتر اپنی مثنوی "داستان نظام علیخان" میں اس کا ذِکر کیا ہے:

سو بخشی بیگم ہو کے غمگین زار
تکلف سے بنوائی ان کا مزار
محجوبہ و نادر و رونق بھرا
وہ بنوائی نواب کا مقبرہ

حضرت بخشی بیگم صاحبہ نے نہ صرف خوبصورت مقبرہ بنوایا بلکہ ہر سال نواب نظام علی خان کے عرس کی طرح بھی ڈالی جو نہایت شاہانہ اہتمام اور کر و فر سے ہوتا تھا۔ شاہ کمتر نے اس عرس کا حال بہت عمدگی اور تفصیل کے ساتھ اپنی مثنوی میں لکھا ہے۔ اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علی خان کے عہدِ حکومت تک نواب نظام علی خان آصف جاہ ثانی کے عرس کا انتظام اور صندل کا اہتمام ہر سال سرکاری طور پر پابندی سے ہوتا تھا۔ نواب نظام علی خان کے مقبرہ کے دروازہ پر حیدرآباد دکن کے مشہور شاعر استادِ سخن شیر محمد خان ایمانؔ کا قطعہ تاریخ وفات کندہ تھا:

بر روح پاک میر نظام علی خان مدام ـ خوانند باوضو ہمہ اشخاص فاتحہ
زین مصرعۂ عجیب دو تاریخ رانجوان ـ مستوجب بہشت و با اخلاص فاتحہ

۱۲۱۸ھ ۱۲۱۸ھ صولت عثمانی ص ۸۳

اعلیحضرت غفران منزل نواب ناصر الدولہ بہادر

مغرب سے مشرق کی سمت دسویں قبر اعلیحضرت غفران منزل نواب ناصر الدولہ (نواب میر فرخندہ علیخان) کی ہے۔ آپ ۲۴ رمضان سنہ ۱۲۰۸ھ بمقام قلعہ بیدر پیدا ہوئے۔ اپنے والد نواب سکندر جاہ بہادر کے انتقال کے بعد ۲ ذیقعدہ سنہ ۱۲۴۴ھ تخت نشین ہوئے۔

انیس ۱۹ روز بیمار رہ کر بعمر پینسٹھ (۶۵) سال ۲۱ رمضان سنہ ۱۲۷۳ھ چھوٹی منجھلی بیگم صاحبہ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ مدت حکومت انتیس ۲۹ سال رہی۔

نواب ناصرالدولہ کے مقبرے پر حسبِ ذیل تاریخ وفات کندہ تھی:

چوں رفت نواب ناصرالدولہ سوئے جنت زدار فانی ؛ خدائش بخشید دکرد بخشش بفضل و رحمت مقام والا
مہ صیام از شہور بودہ است والد دولت وبکیم آن ازمہ ؛ کہ دادش ایزد بقصر جنت بصدر عز مقام والا
سروش غیبی برائے سالش بگوش جان خواند مژدہ خوش ؛ بناصرالدولہ داد ایزد میاں جنت مقام والا

اعلیٰ حضرت غفران مکان نواب میر محبوب علیخان

اعلیحضرت غفران منزل نواب ناصرالدولہ کی قبر کے بعد اعلیحضرت غفران مکان نواب میر محبوب علیخان کا مزار ہے۔ اعلیحضرت مرحوم بروز جمعہ بوقت شب "عشرت محل" متصل "خلوت مبارک" ۵ ربیع الآخر سنہ ۱۲۸۳ھ پیدا ہوئے اپنے والد نواب افضل الدولہ کے بعد بعمر ۲ سال سات ماہ پندرہ یوم تسند نشین ہوئے [۱۵ ذیقعدہ ۱۲۸۵ھ م فروری ۱۸۶۹ء] بیالیس ۴۲ سال حکومت کرنے کے بعد چھیالس ۴۶ سال کی عمر میں سہ شنبہ ۴ رمضان ۱۳۲۹ھ م مارچ ۱۹۱۱ء ایک بجے دن قصر فلک نما میں اس دارِ فانی سے راہی ملک بقا ہوگئے۔ میت قصر چو محلہ مبارک لائی گئی اور رات سوا بارہ بجے مکہ مسجد میں نماز جنازہ کے بعد میت کا تابوت قبر میں اُتارا گیا۔ اعلیحضرت غفران مکان نواب میر محبوب علیخان بڑے نفیر نفش، نیک دل اور صاحب جود و سخا تھے۔ بہ صحیح معنوں میں محبوب الخلائق تھے۔ ایسے غریب پرور بادشاہ کے دنیا سے اٹھ جانے کا رعایا کو بڑا صدمہ ہوا۔ کوئی ایسا نہ تھا جو غمگین نہ ہو اور کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو اشک بار نہ ہو۔

خود اعلیحضرت غفران مکان کا یہ شعر صادق آتا تھا:

اس کا مشتاق ہوں لے آؤ مری میت پر
جس کو لوگوں نے عوض گریہ کے خنداں دیکھا

آپ کے مزار پُر انوار کے کتبے حسبِ ذیل تھے:

الف: روضۂ سلطان محبوب علی [۱۳۲۹ھ]

ب: وانہ فی الآخرۃ لمن الصالحین (۱۳۲۹ھ)
ج: شد بفردوس بریں غفران مکان ؛ میر محبوب علی خان بادشاہ
مصرعہ تاریخ صدیقی بخوان ؛ رحمت حق باد بر آن بادشاہ
(صولت عثمانی ص۹۱)

سلاطین کے اس مقبرے میں اعلحضرت غفران مکان کا ہی ایسا مزار ہے جس پر ہمیشہ ہر وقت سبز غلاف رہتا ہے اور ہر مذہب و ملت کے زائرین گل ہائے عقیدت چڑھاتے ہیں!

شہزادہ نواب صلابت جاہ بہادر اعلحضرت غفران مکان نواب میر محبوب علیخان کے پہلو میں بائیں طرف ان کے عزیز ترین صاحبزادے نواب میر احمد محی الدین علیخان (نواب صلابت جاہ بہادر) مدفون ہیں جو حضرت اجالا بیگم صاحبہ کے بطن سے ۹ رجب سنہ ۱۳۲۵ھ پیدا ہوئے۔ بوقت انتقال اعلحضرت غفران مکان شہزادہ مرحوم کی عمر صرف چار سال تھی۔ ستائیس ۲۷ سال کی عمر میں ان کے بنگلہ "بن ہور" سوماجی گوڑہ ۲۵ ذیقعدہ سنہ ۱۳۵۲ھ وفات پائی[له] حضور نظام نواب میر عثمان علیخان پاپیادہ سوماجی گوڑہ سے توپ کے سانچہ" جنازہ کے ساتھ رہے اور وہاں سے موٹر میں مشایعت کی اور مکہ مسجد میں نماز جنازہ اور تدفین میں شریک رہے۔

شہزادی احمد النساء بیگم صاحبہ شہزادی احمد النساء بیگم صاحبہ اعلحضرت غفران مکان کی سب سے چھوٹی صاحبزادی اور نواب صلابت جاہ کی حقیقی بہن تھیں جو ۲۹ رصفر ۱۳۲۸ھ حویلی قدیم میں پیدا ہوئیں۔ اپنے بھائی نواب صلابت جاہ کے انتقال کے دو ہفتہ بعد علان باغ کنگ کوٹھی میں تیئس ۲۳ سال کی عمر میں مرض چیچک سے شنبہ یکم ذی الحجہ سنہ ۱۳۵۲ھ

له جریدہ غیر معمولی جلد (۶۵) ۳۰ فروری ۱۳۴۳ف ۱۶ ذیقعدہ ۱۳۵۲ھ یوم جمعہ

میں وفات پائی[۱]۔ حضور نظام نواب میر عثمان علی خان جنازہ کے ساتھ پیدل کنگ کوٹھی سے افضل گنج پل تک آئے اور وہاں سے موٹر میں جنازہ کے ساتھ مکہ مسجد تشریف لائے اور نماز جنازہ اور تدفین میں شریک رہے۔ قبر پر رکھے جانے والے فریم میں صرف نام درج ہے تاریخ وفات کا بھی اندراج ہونا چاہیئے۔

شہزادہ نواب آعظم جاہ بہادر

شہزادی احمد النساء بیگم صاحبہ کے بعد اس مقبرہ کی آخری قبر نواب میر حمایت علی خان (نواب آعظم جاہ بہادر) کی ہے۔ نواب اعظم جاہ، اعلحضرت نواب میر عثمان علیخاں کے فرزند اکبر تھے جو ۸ر محرم سنہ ۱۳۲۵ھ تولد ہوئے۔ حضور نظام نے نواب اعظم جاہ کو اپنا جانشین و ولی عہد نامزد کیا تھا لیکن بعض وجوہ کی بنا پر ان کے فرزند نواب مکرم جاہ بہادر کو جانشین بنانے کا اعلان فرمایا۔ نواب اعظم جاہ کا انتقال مختصر سی علالت کے بعد ان کے بنگلہ واقع نجبارہ ہل روز جمعہ ۷ر شعبان المعظم سنہ ۱۳۹۰ھ (۹ر اکتوبر سنہ ۱۹۷۰ء) بارہ بجکر پانچ منٹ پر بعمر ترسٹھ (۶۳) سال ہوا۔

---

[۱] جریدہ غیر معمولی جلد (۵) ۲ رادی بہشت ۴۳ ۱۳ف ۲ر ذالحجہ ۱۳۵۲ھ یوم یکشنبہ۔

مسجدِ جودی اور مزارِ آصفِ سابع

حضور نظام آصف سابع کے محل کنگ کوٹھی کے یادگار پردہ گیٹ (جہاں آج بھی دبیز پردہ آویزاں ہے) کے سامنے کھڑے ہوکر دیکھیں تو سامنے ایک اونچا ٹیلہ نظر آتا ہے۔ حضور نظام کے وقت اس ٹیلے پر عمارتیں نہیں تھیں لہ۔ سب سے پہلے اس پر مسجدِ جودی اور مقبرۂ جودی کی تعمیر حضور نظام نے کی لیکن آج یہاں تین تین منزلہ عمارتیں کھڑی ہیں۔ ان عمارتوں کے وسط میں مسجدِ جودی ایستادہ ہے، اس مسجد سے ملحق مقبرۂ جودی ہے جس میں حضور نظام آصفِ سابع کا مزار ہے۔

مسجدِ جودی کے باب الداخلہ پر دو چھوٹے مینار ہیں اور دروازے کی پیشانی پر سنگ مرمر کی تختی ہے اور اس پر حضور نظام کا یہ قطعہ کندہ ہے:

بہرِ ارواحِ مصفّا مسکنِ بہبودی بود
گفت بار یک نظر منظرِ مشہودی بود
نیست ایں بیت حزن بلکہ ریاضِ فردوس
گفت عثماں کہ ہمیں مقبرۂ جودی بود

اس باب الداخلہ کی پشت پر ایک اور سنگ مرمر کی تختی چسپیدہ ہے اور قطعۂ تاریخ بنائے مسجدِ جودی اس طرح درج ہے:

مادۂ تاریخ مسجدِ جودی
از مسعود علی محوی

لہ البتہ یہاں شاہی موٹر خانہ تھا اور یہیں ایک چھوٹی سی مسجد بھی تھی جسے موٹر خانے کی مسجد کہتے تھے۔

شُد ز جودِ حضرتِ عثمان علی شاہِ دکن
مسجدِ جودی بناؤ قبرِ معصومے دراں
ہست تاریخ بنائے این مقامِ دلکشا
خواب گاہِ شاہزادہ سجدہ گاہِ مرزبان
۱۳ــــــــ ہجری ــــــــ ۵٦

مسجد میں داخل ہوتے ہی ایک وسیع کھلا صحن نظر آتا ہے۔ یہاں کھڑے ہو کر دیکھو تو سیدھی جانب کونے میں سنگ مرمر کی ایک قبر نظر آتی ہے اور قبر کے کتبے پر نام اور تاریخِ وفات موجود ہے۔ دراصل یہ حضور نظام کے ایک خانہ زاد کی قبر ہے جن کا نام یوسف بن حسین المصلی عرف موہن علی تھا۔ کسی نامعلوم شخص نے بندوق سے ان پر فائر کر کے ۱۲ مارچ ۱۹٦۸ء کو انھیں ختم کر دیا اور شاہی قبرستان میں ان کی تدفین ہوئی۔ بائیں سمت وضو کے لیے ٹونٹیاں لگی ہوئی ہیں۔ اسی طرف پیشاب خانہ اور بیت الخلاء ہے صحن کے وسط میں اذان دینے کے لیے اونچا منبر ہے۔ اس منبر کے نیچے چار قبریں سنگِ مرمر کی بنی ہوئی ہیں جن پر ٹین کے ڈھکن ڈھکے ہوئے ہیں۔ قبروں پر جو نام درج ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں مدفون شاہی خاندان کے فرد ہیں۔ ابھی ایک سال پہلے حضور نظام کے دو فرزندوں کا انتقال ہوا تو ان کی قبریں بھی اسی صحن میں بنیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی وقت یہ کھلا صحن شاہی افرادِ خاندان کی قبروں سے پٹ جائے گا۔

آگے بڑھو تو دو باب الداخلے پیشِ نظر ہیں۔ سیدھے ہاتھ کی طرف کا دروازہ مقبرۂ جودی کا ہے اور بائیں طرف کا مسجد میں داخل ہونے کا۔ مقبرے کے باب الداخلہ کی پیشانی پر سنگ مرمر کی تختی پر والدۂ حضور نظام کی تاریخِ وفات صنعتِ تدخلہ اور تخرجہ میں کندہ ہے:

۷۸٦
گفتہ مسعود علی محوی

زنرکِ نعمت دنیا چہ غم بہ مادرِ شاہ
کہ بہرِ او بہ جناح رواح و روح ریحانست
"دُرِ نجف" زبسالے بہ چنین کہ خفتہ بر آن
کنیزِ فاطمہ و اُمِ شاہِ عثمانست
۱۶۹۷ ۳۳۷

یہ بتانا اس موقع پر مناسب ہے کہ جناب مسعود علی محوی جن کے قطعات تاریخی کو حضور نظام نے شرفِ قبولیت بخشا، فتح پور (اودھ) کے متوطن تھے۔ وہ فارسی زبان کے ہمہ داں شاعر تھے اور مرتبہ استادی کا رکھتے تھے۔ حیدر آباد دکن میں سشن جج کے عہدے پر فائز رہے۔

مقبرہ اندر سے مربع اور چاروں طرف پانچ پانچ کمانوں سے گھرا ہوا ہے۔ درمیان میں سنگِ مرمر کی چار قبریں ایک صف میں بنی ہوئی ہیں۔ مغربی سمت میں پہلا مزار حضور نظام میر عثمان علیخاں آصف سابعؒ کا ہے۔ اس کے ساتھ حضور نظام کی والدہ کی قبر ہے، اس سے لگے ہوئے سنگِ مرمر کے چبوترے پر چھوٹی سی قبر شہزادہ جواد جاہ کی ہے اور اس کے بعد دولہن پاشاہ محلِ حضور نظام آسودہ ہیں۔ شمالاً و جنوباً اور مشرق کی سمت جو گیالری ہے، اس میں سنگ مرمر کی اکتیس قبریں شاہی خاندان کے افراد کی ہیں۔ ہر قبر پر نام اور تاریخِ وفات درج ہے۔

صناعی اور سنگ تراشی کا یہاں کمال نہیں البتہ سادگی میں جمال نظر آتا ہے۔ تمام فرش صاف اور چکنے پتھر کا ہے۔ جانب مشرق ایک ہال ہے جس کے دروازے پر سنگ مرمر کی چھوٹی تختی پر موٹے حروف میں "بیت الحزن" لکھا ہوا ہے۔ اسی ہال میں حضرت امام حسینؓ کی ضریح مُبارک شیشے کے فریم میں رکھی ہوئی ہے۔ حضور نظام کے وقت یہاں علم استادہ رہتے تھے اور محرم میں مجلسِ عزا برپا ہوتی تھی لیکن اب صرف ایک چھوٹا سا علم دکھائی دیتا ہے اور محرم میں کبھی کبھی مجلسِ ماتم ہوتی ہے۔ ہال ہمیشہ مقفل رہتا ہے۔ یہ ہال حضور نظام؁

نے اپنے محل دولہن پاشاہ کے انتقال [۱۹۵۵ء] کے بعد بغرض دائمی ایصال ثواب بنوایا تھا اور دو سیدانیوں کو ماہانہ پچاس روپے تاحیات وظیفہ جاری کیا گیا۔ نہ صرف یہ بلکہ تین لاکھ کے بجٹ سے "دولہن پاشاہ ٹرسٹ" قائم ہوا جس کا مقصد مکہ اور مدینہ کے بچوں کی دینی تعلیم کا انتظام کرنا تھا۔ شہزادہ اعظم جاہ اور شہزادہ معظم جاہ نے بھی اپنی ماں کے ایصالِ ثواب کے لیے بعض لوگوں کو پچاس روپے وظیفہ تاحیات اپنی طرف سے جاری کیا۔

شہزادہ جواد علی خاں المخاطب جواد جاہ حضور نظام کے محل لیلیٰ بیگم صاحبہ کے بطن سے پہلے فرزند تھے جو ۵ر شعبان ۱۳۵۴ھ [شنبہ ۲ر نومبر ۱۹۳۵ء] کو پیدا ہوئے، لیکن ڈیڑھ سال کی عمر جب ہوئی تو شہزادہ جواد جاہ ۲۳ر جمادی الاخری ۱۳۵۵ھ [۱۰ر ستمبر ۱۹۳۶ء شب جمعہ] انتقال کر گئے شہزادہ جواد جاہ کی وفات اور ان کے یہاں دفن ہونے کے بعد اس مقبرے اور اس مسجد کی بنا پڑی۔ حضور نظام جواد جاہ کو بہت چاہتے تھے[1] اپنے منظورِ نظر چھوٹے شہزادے کے نام سے مقبرہ اور مسجد کی تعمیر خود حضور نظام کی اس شہزادے سے بے انتہا محبت کا واضح ثبوت ہے۔ اس مقبرے میں ایک تصویر [جس پر پردہ پڑا رہتا ہے] لگی ہوئی ہے جس میں حضور نظام شہزادہ جواد جاہ کو گود میں لیئے کھڑے ہیں جو فرمان جریدۂ غیر معمولی مورخہ ۱۶ر ربیع الاول ۱۳۶۰ھ دوشنبہ شرف صدور لایا، اس حقیقت کو واضح کرتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دوسری طرف یہ مختصر سا خاندانی مقبرہ ہے جس کو میں نے معصوم مرحوم کی یاد میں تعمیر کیا تھا جو کہ اپنی کچھ نہ کچھ حیثیت رکھتا ہے اور بس۔"

شہزادہ جواد جاہ کی قبر پر اس طرح لکھا ہوا ہے:

[۱] سرہانے : مادۂ تاریخِ رحلت (عربی)

مغربی سمت : از قلبِ شکستہ آصفِ سابع

سُبحان اللہ ھذا الصّبی شہیدٌ

۱۳۴۵ف

---

[1] خود حضور نظام نے اپنے دست مبارک سے شہزادہ کو غسل دیا اور لباس آخری پہنایا تھا۔

مشرقی سمت : متعلق وفاتِ حسرت آیات میر جواد علیخاں المخاطب.
پائنتی : جواد جاہ

جواد جاہ کی والدہ جناب لیلیٰ بیگم کا انتقال حضور نظام کی زندگی میں چہارشنبہ ۷ ربیع الاول ۱۳۸۲ھ [اگست ۱۹۶۲ء] کو ہوا۔ ان کی قبر بھی اسی مقبرے میں ہے۔

جواد جاہ کی قبر کے بعد دوسری قبر جوبنی وہ حضور نظام کی والدہ کی قبر ہے جن کا انتقال ۱۶ ربیع الاول ۱۳۶۰ھ (۱۴ اپریل ۱۹۴۱ء) پرانی حویلی میں بعمر ستر سال ہوا۔

[۱] سرہانے : المطمئنۃ ربّک
یاایتھا النفس ارجعی الیٰ۔

[۲] پائنتی : عجب نقشہ کہ این رنج والم ہست
کہ در ماتم بنگر قلم ہست
طوافے می کنم عثماں لحدرا
سرِلوحے چہ تصویرِ دلم ہست

[۳] سیدھی جانب :

درچمن نوحہ کناں غنچہ وگل ہا بودہ
نیز خوں گشتہ دلِ ساغر و مینا بودہ
جام وشیشہ کہ بگشتہ ہمہ پارہ پارہ
رنگِ خونِ جگرے شاملِ صہبا بودہ
آنکہ رفتہ زجہاں بادلِ خرم گفتہ
ہرچہ حاصل کہ شدہ عین تمنا بودہ
او برفت وبہ غم ورنج وتعب عثماں گفت
درحقِ من بنگر ما درِ یکتا بودہ

مقطع تخرجہ ۱۳۶۰ھ [لاریب فیہ]

دوسری سِمت :

مادرِ آصفِ سابع امتہ الزہرہ بیگم در ہفتاد سالہ انتقال کرد۔

اشک ریزاں تو نگہ ہر گل و شبنم اینجا
بہرِ تعظیم نگر سنبلِ پُرخم اینجا
ہر کہ آید بہ زیارت چہ بگوید عثمان
قلبِ محزون تو مدان دیدۂ پُر نم اینجا
اے زہے بخت کہ ایں کوکبِ ناہید شدہ
بہرِ انوار و کرم نیز ہوا عید شدہ

اپنی والدہ کے ساتھ شاہ عثمان نے ہمیشہ ادب و احترام کا سلوک روا رکھا۔ بوقتِ انتقال (۱۳؍ اپریل ۱۹۴۱ء چہار شنبہ) رات ڈیڑھ بجے حضور نظام پُرانی حویلی میں موجود تھے۔ نمازِ جنازہ پُرانی حویلی میں ادا ہوئی۔ خاص و عام کو نمازِ جنازہ میں شرکت کی اجازت دی گئی۔ پونے چھ بجے شام حویلی قدیم سے جنازہ برآمد ہو کر ۱/۲ ۷ بجے شام مسجدِ جودی پونے دو گھنٹے میں پہونچا۔ حضور نظام جنازے کے ساتھ ساتھ پیدل مسجدِ جودی تک چلتے رہے۔ موسم گرما تھا۔ راستے میں کبھی مولانا حضرت سید محمد پاشا حُسینی رح سے کبھی مولانا عبدالقدیر بدایونی اور کبھی شاہی اسٹاف سے مخاطب ہو کر مرحومہ کے اوصاف بیان کرتے جاتے تھے۔ دفن سے پہلے [سوا آٹھ بجے شب] بھی مرحومہ کے فضائل بیان کیے۔

"طوافے می کنم عثماں لحد را"

سے بھی حضور نظام کی اپنی والدہ سے حد درجہ عقیدت مندی کا اظہار ہوتا ہے۔ فرمان جریدہ غیر معمولی مورخہ ۱۶؍ ربیع الاول ۱۳۶۰ھ میں فرمایا "ان کی شفقتِ مادری کا خیال مجھ کو اپنی بقیہ عمر میں سامانِ صبر و تسکین پہونچاتا رہے گا جو کہ بالکل میرے لیے کافی ہے اور ان کی یاد کبھی اور کسی دن میرے قلبِ محزون سے محو نہیں ہو سکتی"۔

مادرِ دکن کی قبر کے بعد تیسری قبر حضور نظام کے محلِ اولیٰ دولہن پاشا

کی اس مقبرے میں تعمیر ہوئی۔ مشرقی سمت سے شمار میں یہ پہلی قبر ہے۔ دولہن پاشاہ ملکۂ دکن تھیں جن کا انتقال بمقام اعجاز باغ متصل عدن باغ ۱۵ار فروری ۱۹۵۵ء سہ شنبہ (۱۳۷۴ھ) ۸ بجے شب ہوا۔ اس وقت حضور نظام تخت سے دست بردار ہو چکے تھے۔ دلہن پاشا، نواب اعظم جاہ، نواب معظم جاہ اور شہزادی پاشا (احمد النساء بیگم) کی حقیقی والدہ اور شہزادہ مکرم جاہ و شہزادہ مفخم جاہ کی حقیقی دادی تھیں۔ از روئے سنہ ہجری عمر (۶۲) سال تھی۔ قبر پر نام اور تاریخِ وفات اس طرح کندہ ہے:

مادۂ تاریخ رحلت دولہن پاشا مرحومہ
(اعجاز النساء بیگم)

شعبدہ ایں چہ ہست یا بازی
گفت عثمانؔ عجیب دم سازی
سالِ رحلت چہ یافتم عثمانؔ
در دکن ہست شانِ اعجازی

۱۳۷۳ھ

بگفت سبزۂ نورس کہ مرغ نالان است
فسردہ غنچہ و گل نیز ہمچو عثمانؔ است
ز فکرِ سالِ وفاتش برآمدہ صد آہ
بہ بیں چہ خفتہ درایں جا کہ اُمِ انیان است

۱۹۵۵ء

تاریخِ وفات پائنتی

۲۱ر جمادی الثانی ۱۳۷۴ھ
مطابق ۱۵ار فروری ۱۹۵۵ء

دولہن پاشا کا خاندانی نام اعظم النساء بیگم ہے لیکن جب ۱۹۰۶ء (۱۳۲۴ھ) عدن باغ میں حضور آصفِ سابع سے عقد ہوا تو بوقتِ نکاح میر محبوب علی پاشا

نے اعجاز النساء بیگم نام عطا کیا۔ چنانچہ یہی عطا کردہ نام قبر پر بھی لکھا گیا۔ دولہن پاشا لقب ہے۔

اب ہم جس مزار کے پاس ادب سے کھڑے ہیں وہ اعلحضرت عثمان علی خاں آصف جاہ سابع آخری تاجدارِ سلطنتِ آصفیہ کا ہے۔ ایک زرین غلاف ہمیشہ قبر پر رہتا ہے اور سال میں ایک مرتبہ برسی کے موقع پر بدلا جاتا ہے سنگِ مرمر کی خوب صورت قبر پر اُبھرے ہوئے گُل بُوٹوں کا کام ہے۔

قبر کا سرہانہ۔ نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہِ سابع خلد مکان

پائنتی۔ تاریخِ وفات ۱۵ ذی القعدۃ الحرام ۱۳۸۶ھ قبر کے اوپر سرہانے۔

لک خیرٌ و احسنٌ قبلاً

قبر کے اوپر چھوٹا تعویذ ہے جو ہرے رنگ کا ہے اور اس میں اُبھرے ہوئے سنہرے حروف میں ایک طرف لا الٰہ الا اللہ اور دوسری طرف محمدٌ رسول اللہ لکھا ہے۔

مزار پر تاریخِ وفات ۱۵ ذی قعدہ لکھا دیکھ کر ہمیں تعجب ہوا۔ حالانکہ حضور آصفِ سابع کا انتقال جمعہ ۱۴ ذی قعدہ ۱۳۸۶ھ مطابق ۲۴ فروری ۱۹۶۷ء دوپہر ایک بج کر بائیس ۲۲ منٹ پر مختصر سی علالت کے بعد نذری باغ میں ہوا۔

دوسرے دن ۲۵ فروری کنگ کوٹھی کے عقبی لان پر شامیانہ لگا کر غُسل دیا گیا۔ بارکس کے معلم کی جماعت نے مولانا فرید پاشا، مولانا قطب الدین حسینی اور مولانا فریدالدین حسینی کی نگرانی میں غسل سر انجام پایا۔ اس کے بعد میت کو کنگ کوٹھی میں شامیانے کے نیچے رکھا گیا تاکہ عوام سلاطینِ آصفیہ کے آخری بادشاہ کا دیدار کر سکیں۔ ۸ بجے صبح میت ساگوان کے صندوق میں رکھی گئی۔ صندوق پر قیمتی قالین ڈالا گیا تھا۔ ۸½ بجے اللہ اکبر کے نعروں میں صندوق امبولنس کار میں رکھا گیا۔ امبولنس کار کے پیچھے چالیس موٹریں اور کئی بسیں تھیں۔ جلوسِ جنازہ عابد روڈ، معظم جاہی مارکٹ، سدی عنبر بازار،

نیا پُل، چار مینار ہوتا ہوا مکہ مسجد پہنچا۔ مکہ مسجد کے دروازے پر کار سے میت اتار کر ساگوان کے ڈولے میں رکھی گئی، اوپر شامیانہ تھا جسے عرب گارڈ تھامے ہوئے تھے۔ جنازہ منبر کے پاس رکھا گیا۔ حضرت حبیب جعفر العیدروس نے نواب مکرم جاہ بہادر کی اجازت سے نماز جنازہ پڑھائی۔ دو لاکھ افراد نے نماز جنازہ پڑھی۔ جنازہ جب باہر آیا تو فوجی جوانوں نے جنازہ حاصل کیا۔ میت پر زرد آصفی پرچم اُڑایا گیا۔ ایمبولنس میں نواب مکرم جاہ بہادر نواب مفخم جاہ بہادر اور شہزادی پاشاہ [صاحبزادی حضور نظام] میت کے ساتھ تھے۔ لاکھوں لوگوں کا ہجوم، سب کے مغموم چہرے۔ حیدرآبادیوں کے دل میں وہی ادب و احترام موجزن تھا۔ جو حضور نظام کی زندگی میں محسوس ہوتا تھا۔

مسجد جودی سے کچھ فاصلہ پر کار ٹھہرائی گئی۔ عرب گارڈ نے جنازہ اُٹھایا اور قبر تک پہنچایا۔ عرب فوجی دستہ اور سکھ پلٹن صرف خاص کے لباس میں ہاتھ میں برہنہ شمشیر لیے میت کے ساتھ ساتھ تھے کنگ کوٹھی کے انجینئر مسٹر کیو سوامی کی نگرانی میں قبر تیار ہوئی تھی۔ قبر میں عنبر اور عبیر کے علاوہ عرقِ گلاب چھڑکا گیا۔ حضور نظام کے دو ملازمین منصور علی اور محمد بن بابلّیل نے دوسروں کی مدد سے سفید کفن میں لپٹی ہوئی میت چار فٹ گہری قبر کے اندر اللہ اکبر کے نعروں میں اُتار دی۔ نواب اعظم جاہ، نواب معظم جاہ، نواب مکرم جاہ، نواب مفخم جاہ اور دوسرے شہزادوں نے مٹی دی۔ قبر پر پتھر کے اٹھارہ سل رکھے گئے اور پھر مٹی سے قبر ڈھانپ دی گئی۔ مولانا حبیب احمد گنوان نے لحد پر ہاتھ رکھ کر تلقین پڑھی اور پانی ڈالا۔ حضرت حبیب جعفر العیدروس نے دُعا پڑھی۔

تدفین سرکاری اور فوجی اعزاز کے ساتھ عمل میں آئی۔ مسلح پولیس نے لاسٹ پوسٹ بجایا۔ فوجی سپاہیوں نے بندوق سر کئے۔ اُس وقت کے چیف منسٹر برہما نند ریڈی، ڈاکٹر چنا ریڈی، انسپکٹر جنرل پولس، وزراء، عہدہ دار علماء و مشائخ موجود تھے۔ تدفین کے بعد عوام کو اندر جانے کی اجازت دی گئی۔

تمام دفاتر، اسکولوں اور کالجوں کو اس دن تعطیل دی گئی۔ دو روز تک سینما احتراماً بند رہے۔ فاتحہ سوم دوشنبہ ۲۷ر فروری کی صبح مکہ مسجد میں ہوئی اور بعد فاتحہ مولانا فرید پاشا صاحب نے منبر سے نواب مکرم جاہ بہادر کی جانشینی کا اعلان کیا۔

حضور نظام آصف جاہ سابع ۲۹ر جمادی الثانی ۱۳۰۳ھ [۵ا/اپریل ۱۸۸۶ء] کو پیدا ہوئے اور ۱۳۲۹ھ مطابق ۲۹ر اگست ۱۹۱۱ء کو بعمر چھبیس ۲۶ سال تخت نشین ہوئے۔ ایک مختارِ کل بادشاہ کی حیثیت سے حیدرآباد دکن پر انصاف پروری کے ساتھ سینتیس ۳۷ سال تک فرماں روائی کی۔

سقوطِ حیدرآباد ۱۳۶۷ھ (۱۹۴۸ء) کے بعد حکومت سے دست بردار ہوئے جب کہ آپ کی عمر چونسٹھ (۶۴) سال تھی۔ مزید انیس ۱۹ سال بہ قیدِ حیات رہنے کے بعد ۱۴ر ذی قعدہ ۱۳۸۶ھ [۲۴ر فروری ۱۹۶۷ء] بعمر تراسی (۸۳) سال اس دنیائے ناپائیدار سے عالمِ جاودانی کو روانہ ہوئے آپ کی تخت سے دست برداری سے سلطنتِ آصفیہ کا دو صد ۲۰۰ سالہ شاندار دَور ختم ہوگیا۔ حضور آصف سابع نے فرمایا تھا:

کرے گا اہلِ دولت کو نہ کوئی یاد اے عثماںؔ
صحائف ہی میں دفن افسانۂ جاہ حشم ہوں گے

لیکن اعلیٰ حضرت آصف جاہ سابع دُنیا کے ان دولت مندترین لوگوں میں اس امتیازی مقام پر تھے جنھوں نے رفاہِ عام کے ہزاروں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ آپ کے بنائے ہوئے ٹرسٹ جن سے آج بھی بلا لحاظِ مذہب و ملت، طالب علموں، تعلیمی اِداروں، غُربا، معذوروں، بیواؤں کو فیض پہنچ رہا ہے۔ رفاہِ عام اور علم و فن کی ترقی کے لیے جو کچھ حضور نظام نے کیا اگر کوئی لکھنے بیٹھے تو کئی جلدوں کے ورق تمام ہو جائیں گے اور مدح باقی رہے گی۔

مقبرے کے ملحق مغربی سمت مسجدِ جودی ہے۔ سامنے پانچ خوبصورت

کمانیں بنی ہوئی ہیں درمیان کی کمان پر سنگ مرمر کی تختی پر حضور نظام کا قطعہ کندہ ہے:

۷۸۶

مادۂ تاریخ بنائے مسجد جودی
جلوہ در خانۂ خدا بنگر
نور در شکلِ مصطفےٰ بنگر
از زبانِ نبی شنو عثمانؔ
علم باللہ بہ مرتضےٰ بنگر
۱۹۴۳ء

مسجد نہایت پاک و صاف اور فرش و فروش سے آراستہ ہے۔ امام اور موذن مقرر ہیں اور پانچ وقت نماز ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ نماز جمعہ عیدین اور پھر رمضان میں تراویح کا بھی انتظام ہے۔ ہمہ وقت چار پہرہ دار موجود رہتے ہیں جن کے ذمہ مقبرے اور مسجد کی نگرانی اور صفائی ہے۔ دفتر ناظم امور مذہبی صرف خاص ٹرسٹ ایچ ای ایچ دی نظام اس مسجد کے عقب میں ہے جس کے ذمے شاہی مساجد اور شاہی مقابر کی دیکھ بھال اور نگرانی کرنا ہے چنانچہ دفتر کی جانب سے اس مسجد اور مقبرے کا حسنِ انتظام قابلِ تعریف ہے ہر جمعہ کو مقبرے کی تمام قبروں پر غلاف چڑھائے جاتے ہیں اور نام کی تختی رکھی جاتی ہے اور بعد نمازِ جمعہ آصفِ سابع کے مزار پر پھول چڑھائے جاتے ہیں اور فاتحہ خوانی ہوتی ہے۔

حیدرآباد کی یہ واحد مسجد ہے جہاں نمازِ جمعہ کے خطبے میں نواب میر برکت علیخاں مکرم جاہ بہادر کا نام لیا جاتا ہے۔

سواری شاہانہ اور عوام کی تکلیف کا احساس

اعلیحضرت غفران مکان نواب میر محبوب علی خاں کی سواری مبارک جب برآمد ہوتی تو پولیس کی جانب سے بادشاہ کے گزرنے کے راستوں پر سخت انتظام ہوتا تھا۔ گھنٹوں لوگ اور سواریاں رُکی رہتیں۔ بادشاہت میں شاہی انتظامات پر حرف گیری جرم سمجھا جاتا تھا لیکن اعلیحضرت غفران مکان محبوب علیخان کے عہدِ حکومت ہو یا اعلیٰ حضرت حضور نظام آصف سابع کا دورِ شاہی اس زمانے کے اخبارات دیکھنے سے یہ بات واضح ہے کہ صحافت کو اس حد تک آزادی تھی کہ وہ حکومت کے نظم ونسق پر بجا طور پر حرف گری کرے چنانچہ عوام کی تکالیف اور احساسات کی ترجمانی ذریعہ اخبار کی جاتی تھی۔ اہم اُمور کی بابت اخبار کے تراشے روز پیش گاہ خسروی میں پیش ہوتے تھے اور ملاحظہ سے گزرتے تھے۔ سرکار کی جانب سے متعلقہ عہدہ دار کا جواب طلب ہوتا اور احکام صادر ہوتے۔ شاہی سواری نکلتے وقت پولیس کی جانب سے جو انتظامات ہوتے تھے اور جن تکالیف کا سامنا عوام کو کرنا پڑتا تھا اس کا ذکر کرتے ہوئے اخبار نے مجلس صفائی کو پیش گاہ خسروی میں معروضہ گزارنے کی خواہش کی:۔

"اس موقع پر ہم پیش گاہ ملازمان حضرت اقدس میں ایک ناچیز گزارش کئے بغیر نہیں رہتے کہ چونکہ آج کل حضرت کی سواری مبارک بلاناغہ برآمد ہوتی ہے اور اندرونی راستے بہت تنگ ہونے کی وجہ سے سواری نکلنے سے دو چار گھنٹے پہلے ہی راستہ پر جھٹکے اور شکرام وغیرہ اور بعض بگیاں بھی چلنے سے روک دی جاتی ہیں اور اس سے بندگانِ خدا کو جو تکلیف اور ان کے کاروبارِ ضروری میں جو ہرج واقع ہوتا ہے اس کا اندازہ وہی لوگ بخوبی

کر سکتے ہیں۔ جنھیں تجربہ ہوا ہے کوئی زنانی سواریوں کا جھٹکہ ہے کہ بیمار دل کو لیے دواخانہ جاتا ہے کوئی بے چاریاں کسی کے گھر مہمان جانے کو نکلی ہیں اور کوئی کسی کی میت میں شریک ہونے جاتا ہے اور سب کے سب عین راستوں میں اڑے کھڑے ہیں اور پولس والے کی منتی کرتے ہیں خوشامد کرتے ہیں مگر وہ ذرا ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ فرعون بے سامان بنا کھڑا ہے۔ اگر سرکار اپنے نکلنے سے پندرہ منٹ پہلے ایسا فرمادیں اور پولس والے بیٹ کے جوان اپنے آگے والے کو بذریعہ سیٹی کے اطلاع دیں تو بطور ٹیلفون کے حضرت کی آمد آمد کی اطلاع ہو جائے گی اور جہاں کے تہاں گاڑی جھٹکے چلنے سے چند منٹ کے لیے رک جائیں گے جس سے مطلب راستہ روکنے کا بھی پورا ہو جائے گا اور ناحق بندگان خدا کو بھی تکلیف نہ ہوگی۔ امید ہے کہ مجلس صفائی اس تجویز کو پیش گاہ سرکار میں گزارنے کا فخر حاصل کرے گی"۔

یہ ایک اخبار کا تراشہ ہے مگر معلوم نہیں ہوتا کہ کون سا اخبار ہے۔ تراشہ کی پشت پر تاریخ پنجشنبہ ۳ر شعبان المعظم ۱۳۱۴ھ ہفتہ وار مدراس اور جلد (۹) درج ہے۔

حضرت محبوب علی پاشاہ اخبار پڑھ کر اس تکلیف سے متاثر ہوئے جو آپ کی سواری نکلتے وقت رعایا کو ہو رہی تھی۔ عوام کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے فوراً ہی کوتوال شہر نواب سلطان یاور جنگ کو اخبار کا تراشہ بھیجا باز پرس کی اور جواب طلب کیا اور آئندہ کے لیے تاکیدی حکم دیا۔ دکن کے ہر دل عزیز حکمران محبوب علیخان پاشاہ کے دست مبارک سے لکھا ہوا یہ مختصر سا نوشتہ اس نیک نفس پاشاہ کی رعایا پروری اور انصاف پسندی کی معتبر دستاویزی شہادت ہے۔ [راقم الحروف کے پاس یہ نوشتہ موجود ہے]۔

نوشتہ :-

اخبار کا یہ پرچہ روانہ کیا ہوں۔ میں نے جو کچھ اس بارہ میں تم کو لکھا تھا تو یہ نہیں لکھا تھا کہ میری سواری آنے کے قبل دو چار گھنٹے سب کو روکو بلکہ میں

نے یہ بھی نہیں لکھا تھا کہ میرے آنے کے دو چار منٹ پیشتر آگے بھی کسی کو روکا جائے
راستہ میں جو کوئی درمیان میں آئے اس کو موٹر کار آتی دیکھ کر بازو کردو۔
راستہ کے سمت آنے دو۔ کار ایک چشم زدن میں چلی جاتی ہے بعد آتی دیر کے
واسطے اگر کوئی سواری رُکے بھی تو یہ کوئی دیر نہیں ہے اگر تم نے کوئی حکم اپنے
طور پر کوتوالی کو دیا ہے جس کے سبب سے سواریاں یا لوگ روکے جاتے ہیں
تو اس کو منع کردو اور آئندہ سے کوئی سواری یا لوگ مری سواری آتے ہی اس
خیال سے دو چار تو کیا دو چار منٹ بھی مرے واسطے روکے جائیں اس کا معقول
بندوبست کیا جائے اور یہ حکم تاکیدی ہے۔

شرح دستخط

۱۷ شعبان ۱۳۲۴ھ شنبہ

جمال صاحب میاں

لوگ اپنی قسمت پر ناز کرتے ہیں لیکن بعض اللہ کے بندے ایسے بھی ہیں جن کی قسمت پر خود قسمت ناز کرتی ہے۔ جمال صاحب میاں کا شمار بھی اِن ہی خوش نصیبوں میں ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ عالم فاضل تو کیا لکھے پڑھے بھی نہ تھے۔ طبقہ امراء میں شمار نہ ریاست کے کسی عہدۂ جلیلہ پر متمکن۔ بس اِتنا ہے کہ اعلیٰ حضرت غفران مکان نواب میر محبوب علیخان خسرو دکن اِن کو از حد چاہتے تھے۔ محبت کی شریعت میں نسبت بڑی چیز ہے۔ محبوب علی پاشاہ جیسے نیک دل بادشاہ سے ان کی اِسی نسبت کے طفیل ان کا نام تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ محفوظ رہے گا۔ جعفر برمکی سے خلیفہ ہارون رشید کا تعلق خاطر اور سلطان محمود غزنوی کی ایاز سے شیفتگی افسانہ کہن سہی مگر حقیقت ہے۔

محمود غزنوی کہ ہزاران غلام داشت
عشقش چناں گرفت کہ غلامِ غلام شد

اور اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ کوئی مورخ اگر شاہ دکن اعلیحضرت غفران مکان نواب میر محبوب علی خاں کے حالات زندگی زیب قرطاس کرے اور جمال صاحب میاں کا ذکر نظر انداز کرے تو اس کا مقالہ تشنۂ تکمیل رہے گا۔

محبوب علی پاشاہ نے اپنا انیس و جلیس بنایا بھی تو کسے اور چاہا بھی تو کس کو؟ ایک لاابالی فقیر۔ طبیعت کا ضدی۔ فطرت میں بے نیازی و بے پروائی۔ مگر کسی نے جو یہ کہا ٹھیک ہی ہے کہ جس کو پیا چاہے وہی سہاگن کہلائے۔ نہ جانے مزاج شاہانہ کو اس قلندر کی کون سی ادا بھا گئی تھی۔ محل میں ساتھ رکھتے تھے۔ ہم نوالہ و ہم پیالہ بنایا۔ سیر و شکار میں اسیر دام

غفران مکان نواب میر محبوب علیخاں اپنے جلیس جمال میاں کے ساتھ

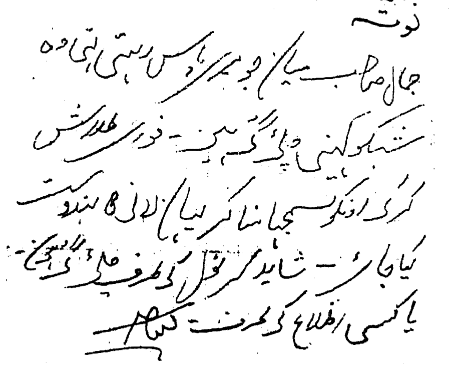
نوشتہ
جمال صاحب میاں جو میرے پاس رہتے تھے وہ
شب کو کہیں چلے گئے ہیں۔ فوری تلاش
کرکے انکو سمجھا بنا کر یہاں لانے کا بندوبست
کیا جائے۔ شاید سرکوتوال کے طرف چلے گئے
یا کسی اطلاع کے طرف

عکسِ تحریر غفران مکان نواب میر محبوب علی خان
بنام نواب سلطان یاور جنگ کوتوالِ شہر

محبت بناکے لے جاتے۔ لیکن جمال صاحب میاں نے بھی عجیب طبیعت پائی تھی۔ یوں کھئیے کوئی ناز بردار ہو تو ناز کرنے میں بھی مزہ آتا ہے۔ بس غالب کے محبوب کا حال تھا کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے۔ بغیر کچھ کہے محل سے غائب ہو جاتے تو اعلیحضرت غفران مکان بے چین و بے قرار ہو جاتے۔ کھانا نہیں کھاتے۔ کوتوال شہر کو فوراً تلاش کرنے کی ہدایت دیتے۔ ہر طرف ہرکارے دوڑائے جاتے۔ چنانچہ ایک دفعہ یہ حضرت چپکے سے رات کو محل سے چل دیئے۔ سمع ہمایونی تک اطلاع گزارنی گئی تو حضور عالی مرتبت نے جلدی اور پریشانی میں پنسل ہی سے کوتوال شہر کو نوشتہ لکھا جو راقم کے پاس محفوظ ہے:

نوشتہ

جمال صاحب میاں جو میرے پاس رہتے تھے وہ شب کو کہیں چلے گئے ہیں۔ فوراً تلاش کرکے اِن کو سمجھا مناکر یہاں لانے کا بندوبست کیا جائے شاید کرنول کی طرف چلے گئے ہوں یا اضلاع کی طرف

شرح دستخط

"سمجھا مناکر" لانے کے الفاظ میں کتنی دل نوازی ہے۔ کیا شان محبوبی ہے کہ ان کے دل کو ٹھیس نہ لگے!

سنہ ۱۳۲۷ھ میں محبوب علی پاشاہ نے اپنے عزیز و محبوب شہزادہ نواب میر احمد محی الدین علیخان (صلابت جاہ) کی سالگرہ میں ڈنر پہ اپنے خاص خاص امراء کو مدعو کیا تھا۔ اس پُر مسرت موقع پر حضور نے طبعزاد اشعار سنائے جن میں امرا، عہدہ دار اور خاص خاص مصاحبین کا ذکر ہے شاہ گدا نواز نے انھیں نفیر بے نوا سمجھ کر نظر انداز نہیں کیا۔ یاد رکھا اور عزت و توقیر کے ساتھ ذکر کیا: آج خوش ہو کر مبارک باد دینے کے لیے

حاضر دربار ہیں سب جاں نثار باوقار

خوش نویس خاص جن کے نام میں محمود ہے

اور میاں صاحب جمال نیک دل ذی اعتبار

مہاراجہ کشن پرشاد [سابق پیشکار و وزیراعظم حکومت آصفیہ] نے ایک مختصر سی کتاب "قدوم سلطانی" کے نام سے لکھی ہے۔ جس میں اپنے اور اعلیحضرت غفران مکان کے شکار کے کچھ واقعات لکھے ہیں۔ جمال صاحب میاں بھی اعلیحضرت کے ساتھ "میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں" کے مصداق گئے تھے۔ حسبِ عادت کیمپ سے غائب ہو گئے۔ مہاراجہ بہادر نے اس واقعہ کو لکھا ہے جمال صاحب میاں کے تعلق سے یہ ایک اہم اور مستند بیان ہے۔

"چار بجے کیفیت معلوم ہوئی کہ جمال صاحب میاں جو حضرت پیر و مرشد کی بارگاہ میں ہمیشہ حاضر رہتے ہیں اور حضرت کے مورد عنایت ہیں بطور سیر بلا اجازت اپنے جذبہ شوق میں کہیں چلے گئے ہیں۔ یہ شخص ایک ولی صفت آدمی ہے۔ کم سخن آشنا پرست مگر دوست دشمن سب کے ساتھ ایک ہی برتاؤ۔ نفع اور ضرر کا خیال نہیں۔ دوست سے ملنے کی شادی نہ نقصان کا غم۔ راحت کی قدر نہ مصیبت کی تکلیف سے متاثر شادی و غمی گویا دونوں ایک ہیں۔ آسودۂ عشق نہ آلودۂ فسق۔

اسی ریاست کے رہنے والے۔ اسی ریاست کی پیدائش۔ یہیں گزران ہوئی تھی۔ جب تقدیر نے یاوری کی تو دربدر سگ ہوسی سے نجات پاکر آستانۂ شاہی تک رسائی پائی۔ طبیعت کی خوبیوں کی بدولت مرحمت پر مرحمت بڑھنے لگی۔ قسمت کے ستارے چمک گئے۔ قدم بوسی شاہ کا فخر حاصل ہوا۔ مقصود کی کنجی دستیاب ہوئی۔ انواع واقسام کی عنایتوں سے عزت پائی۔ صحبت موافق طبع ہوئی تو لطف گرم جوشی رہا۔ بہرحال بارگاہ شاہی میں بار پایا۔ وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَنْ يَشَاءَ اللَّهُ۔

ان کے گم ہونے کی خبر جو کیمپ میں مشہور ہوئی چار طرف دوڑ دھوپ ہونے لگی۔ جاسوس روانہ ہوئے۔ صید وابستۂ کمند شاہی کبھی کہیں جانے پاتا ہے بمصداق بلا کشان محبت بہ کوئے یار روند آستانۂ شاہی پر حاضر ہو کر سری ٹیک کی گرچہ دو دیدم لیبے منزل من کوتے دوست۔ انھیں

اس کی کیا پروا کہ ہوا کیا اور ہوگا کیا۔ یہ فعل مجرمانہ تھا یا راہ صواب کے راہرو تھے۔ جس کسی نے پوچھا میاں! کہاں گئے تھے۔ ہنس کر کہہ دیا کہ ہمارا ملک ہے ہم جہاں چاہیں وہاں رہیں گے۔ کہاں اپنے ملک ہی میں سیر کرنے گئے تھے۔ بخدا اپنے ملک کی ایک ہی کہی۔ سچ ہے جس کا بادشاہ ہو اس کا ملک اس کا کیوں نہ ہو۔ الغرض آیۂ رحمت الٰہی ظل سبحانی نے بخندۂ پیشانی ان کی طرف متوجہ ہو کر اپنی خطا پوش نظر سے کام لیا اور اس حرکت سے چشم پوشی فرمائی“ (قدوم سلطانی صفحہ ۳۴، ۳۵، ۳۶)

محبوب علی پاشاہ ان سے اس درجہ بے تکلفی برتتے تھے کہ امتیاز شاہ وگدا مٹا دیا تھا۔ گویا ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز کی تصویر نظر آتی تھی۔ ایک تصویر میں حضور ان کے زانو پر سر رکھے لیٹے ہیں کبھی میں گلے میں ہاتھ ڈالے ہوئے ہیں۔ یہ جو تصویر ہے اس کی روایت یہ ہے کہ سرکار انھیں اپنے ساتھ شانہ بہ شانہ کرسی پر بٹھا کر تصویر اتروانا چاہتے تھے لیکن وہ بپاس ادب و بلحاظ فرق مراتب اس پر ہرگز راضی نہ ہوئے اصرار شاہانہ بڑھنے لگا جس کی تاب نہ لا کر بالآخر کرسی لات مار کر گرا دی اور پیچھا چھڑا کر فرار ہونا چاہتے تھے۔ شاہ عالی قدر کسی نہ کسی طرح ان کی شیروانی کی آستین مضبوطی سے پکڑ کر انھیں اپنے ساتھ بٹھائے رکھا ہے۔

ان کی طبیعت کا اصل جوہر پاس ادب تھا۔ اعلیٰ حضرت کتنی ہی بے تکلفی سے پیش آتے اور ادب شاہی کو درکنار رکھتے مگر جمال صاحب میاں حد ادب سے سر مو تجاوز نہ کرتے اور ”ایاز قدر خود بشناس“ کے مصداق وفور التفات شاہانہ کو دیکھ کر کبھی خود فراموش نہ ہوتے۔

وہ اپنے آقائے ولی نعمت کی بے لوث رفاقت اور جاں نثاری میں اپنی آپ مثال تھے۔ طبیعت میں حد درجہ استغنا تھا اور کسی چیز کی طمع ان میں نہ تھی۔ وہ اپنی معمولی خدمت پر قانع رہے اور کبھی کسی کی تمنا نہ کی۔ اعلیٰحضرت غفران مکان نے انھیں منصب سے نوازنا چاہا مگر انھوں نے

نہ کیا۔ جب بھی انھیں بارگاہ خسروی سے کوئی انعام ملتا تو وہ ڈیوڑھی
شوں کی نذر کر دیتے۔ یہی اوصاف تھے کہ اعلیٰ حضرت ان کے بے حد
رگرویدہ تھے۔

حضرت غفران مکان نواب میر محبوب علی خان کے انتقال [۱۳۲۹ھ]
حضرت نواب میر عثمان علی خان آصف سابع نے اپنے والد کے جلیس
صاحب میاں کا بہت پاس و لحاظ رکھا۔ شاہی محل عدن باغ میں ان
کا انتظام کیا۔ دس گیارہ سال مزید وہ زندہ رہے لیکن ان کے
کے گزر جانے کے بعد کسی نے ان کو خوش نہیں دیکھا۔ ہمیشہ افسردہ
ے۔ کبھی بے ساختہ یاد آتی یا کبھی اپنے چاہنے والے کی تصویر دیکھ
قابو ہو کر رونے لگتے۔ وہ کس پر ناز کرتے اس لیے محل چھوڑ کر
ہیں اور نکلا تو ان کا جنازہ محل سے نکلا۔ ؎

آفریں داغ تجھے خوب نباہی تو نے
مرحبا کوچۂ دلدار سے مر کر نکلا

گئے تھے اور ضعیفی میں بھی حفظ مراتب اور آداب شاہی کا ہمیشہ
ب ان کی عزت کرتے تھے لیکن وہ نو عمر اور کمسن شہزادے اور
کے سامنے بیٹھتے تک نہ تھے۔ ادب سے کھڑے رہتے تھے ان
ٹھ کرنا بھی خلاف ادب تھا۔

ایتیں تو بہت ہیں لیکن میرے ایک قریبی دوست کا چشم دید
موصوف نے جمال صاحب میاں کو حضور آصف سابع کے ساتھ
مسجد [بنائے مسجد ۱۳۴۳ھ] میں آتے دیکھا ہے۔ بہت ضعیف
۔ اس حال میں واپس ہوتے کہ ایک طرف سے شہزادہ صلابت
سری جانب سے شہزادہ بسالت جاہ ان کی کمر میں ہاتھ ڈالے
ساتھ چلتے تھے۔

ہے کہ اہل علم اصحاب جنھیں تاریخ اور تحقیق سے دلچسپی ہے میری

اس علمی و تحقیقی کوشش کی اہمیت محسوس کریں گے اور اس خصوص میں مزید معلومات بہم پہنچائیں گے۔ یقیناً جمال صاحب میاں کے ذکر سے غفران مکان کے حالاتِ زندگی کے صحیفے میں مزید ایک باب کا اضافہ ہوگا۔

چبوترہ سیّد علی

حیدرآباد کے مشہور ادیب و محقق جناب تمکین کاظمی صاحب مرحوم کا ایک مضمون "شاہ علی بنڈہ" کتاب "حیدرآباد کی داستان" میں صفحہ (۴۱) پر موجود ہے۔ اس مضمون میں موصوف نے ایک جگہ لکھا ہے "راجہ شاہراج کی دیوڑھی سے آگے مولوی زماں خاں شہید کا مکان، مقبرہ، مدرسہ واقع ہے۔۔۔۔ اس مزار کے آگے سیّد علی چبوترہ ہے۔ یہ بھی ایک بزرگ تھے جو چبوترہ پر مدفون ہیں"۔

راقم الحروف اسی محلہ چبوترہ سید علی کا باشندہ ہے اور آباء و اجداد تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے اسی بستی میں آباد ہوئے اور یہیں آسودہ خاک ہیں۔ اس خیال سے کہ جناب تمکین کاظمی صاحب جیسے بلند مرتبہ محقق کا بیان کسی غلط فہمی کا باعث نہ بنے۔ اس لیے تا بہ حد علم اظہارِ خیال ضروری سمجھا ہوں۔

"محلہ چبوترہ سید علی" ایک قدیم محلہ ہے۔ اس کے مشرق میں محلہ خزانہ جل پلی مغرب میں محلہ شکر گنج و غازی بنڈہ، جنوب میں محلہ علی آباد اور شمال میں محلہ بازار روپ لال جیسے قدیم محلے آباد ہیں۔ لیکن اس وقت محلہ چبوترہ سید علی کا دائرہ اتنا وسیع ہو چکا ہے کہ متذکرہ محلوں کے نام اس کے آگے ماند پڑ چکے ہیں۔ ہر جگہ چبوترہ سید علی کا سکّہ چلتا ہے۔

"تاریخ دکن" مؤلفہ محمد نصر اللہ خاں مطبوعہ سنہ ۱۲۸۵ھ یارہ سو پچاسی ہجری میں حیدرآباد کے قدیم محلہ جات کی فہرست موجود ہے۔ اس میں محلہ چبوترہ سید علی کا نام درج ہے۔ گویا آج سے ایک سو تئیس (۱۲۳) سال پہلے اس

محلہ کا نہ صرف وجود تھا بلکہ بہ حیثیت محلہ اس کی شہرت ہو چکی تھی۔ میرے پاس اس مقام کی ایک زمین کے ہبہ نامہ کی نقل موجود ہے جو سنہ بارہ سو چوّن (۱۲۵۴ھ) میں تکمیل پایا۔ اس دستاویز میں اس محلہ کا نام "زیناپور عرف علی آباد" بلدہ فرخندہ بنیاد حیدرآباد" بتلایا گیا ہے۔ یہ تو زمانہ کا دستور ہے کہ انقلابات زمانہ کے باعث بستیوں کے نام بدل جاتے ہیں۔ ایک نام کی جگہ دوسرے نام کا شہرہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ کسی نہ کسی طرح محلہ چبوترہ سید علی کا نام محلہ زیناپور کا قائم مقام ہو گیا۔

راقم الحروف کے گھر سے چبوترہ چند قدم کے فاصلے پر ہے۔ سڑک کے کنارے چھ گز لمبے اور چار گز چوڑے چبوترے کو اسی حالت میں بچپن سے دیکھ رہا ہوں۔ اس وقت کھلا چبوترہ تھا نہ چھت تھی نہ حصار تھا۔ ہم محلے کے بچے اکثر اس چبوترہ پر کھیلا کرتے تھے۔ ہر سال وائسرے بہادر حیدرآباد آتے تو ان کا قیام فلک نما پیلس میں ہوتا۔ ہم بچے اپنے بڑوں کے ساتھ اس چبوترہ پر بیٹھے وائسرے بہادر اور اعلیٰ حضرت حضور نظام کی آمد و رفت کا شاہانہ انتظام دیکھا کرتے۔ قدیم زمانے سے آج تک اس چبوترے پر محرم کی چار تاریخ چار علم چار خلیفہ کے نام سے ایستادہ ہوتے ہیں۔ ان کا لباس سفید، پیتل کے اوسط سائز کے پنجے اور ہر پنجہ پر ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، حیدرؓ کندہ کیا ہوا ہے۔ نہ ان علموں کی سواری نکلتی ہے نہ یہ اٹھتے ہیں۔ محرم کی گیارہ تاریخ دن کے گیارہ بجے دکن کی زبان میں یہ وہیں ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ میں نے کئی جہاں دیدہ اصحاب سے پوچھا سب نے یقین سے کہا کہ دنیا بھر میں چار خلیفہ نام کے یہ واحد علم ہیں جو صرف چبوترہ سید علی پر بیٹھتے ہیں۔

پولس ایکشن ۱۹۴۸ء کے بعد فوج کے ایک وظیفہ یاب میر ریاست علی صاحب محلہ غازی بنڈہ میں سکونت پذیر ہوئے کئی خوبیوں کے علاوہ بڑے متحرک اور مستعد شخص تھے۔ چنانچہ بے کاری کو کارآمد بنانے کے لیے

انھوں نے چاء خانہ کا منصوبہ بنایا اور سید علی صاحب مرحوم کے ایک وارث حبیب حسین صاحب سے یہ چبوترہ دس روپے کرایہ ماہانہ پر حاصل کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے چبوترہ کے گرد بہری لکڑی کی جال کا حصار بن گیا اور اوپر ٹین کا شیڈ پڑ گیا۔ ۶؍ فروری ۱۹۴۹ء چبوترہ پر ہوٹل قائم کر کے "داحد گرین رسٹورنٹ" کا بورڈ لگا دیا گیا۔ میر ریاست علی صاحب مرحوم جیسے منتظم کی نگرانی میں اس ہوٹل کی بڑی شہرت ہوئی یہاں تک کہ چبوترہ سید علی کا دوسرا نام جال کا ہوٹل ہو گیا [جو آج تک مشہور ہے] جائیداد کا معاملہ اس افراتفری کے دور میں آمدنی کا سوال اور کشش تھی۔ اس لیے سید علی صاحب کے ورثاء میں ملکیت کے لیے نزاع پیدا ہوئی۔ آخر وقف بورڈ میں فریقین کے ادعا کی سماعت ہوئی۔ پانچ سال تک مقدمہ زیرِ دوراں رہنے کے بعد وقف بورڈ نے حبیب حسین صاحب کے حق میں فیصلہ سناتے ہوئے چبوترہ سید علی کو عاشور خانہ قرار دیا اور اسے درج رجسٹر اوقاف کیا اور قائم شدہ ہوٹل برقرار رکھتے ہوئے حبیب حسین صاحب کو کرایہ وصول کرنے کا مجاز گردانا۔ تقریباً بیس پچیس سال تک میر ریاست علی صاحب کی نگرانی میں ہوٹل نہایت کامیابی سے چلتی رہی۔ لیکن ان کے انتقال کے بعد کئی اصحاب نے ہوٹل چلانے کی کوشش کی لیکن پنپ نہ سکے۔ ابھی حال میں اس میں میوہ کی دوکان قائم ہوئی تھی چند مہینے بعد یہ بھی بند ہو گئی۔ اس وقت چبوترہ سید علی جال کا ہوٹل نمبر ۵۶۶-۶-۲۰ بند اور مقفل ہے۔

سید علی صاحب جن کے نام سے چبوترہ قائم ہے محلہ کے شرفا میں سے تھے۔ یہ چبوترہ یہ مقام ان کی ملک تھا۔ سید علی صاحب کوئی ولی، بزرگ عالم یا شاعر نہ تھے۔ ان کا انتقال اسی محلہ میں ہوا لیکن ان کی تدفین کسی اور جگہ ہوئی۔ اس چبوترہ پر نہ وہ دفن ہوئے نہ یہاں ان کا مزار ہے کیسے کیسے جیّد علماء، نامور شاعر، خدا رسیدہ بزرگ اور امیر امراء اس محلے میں رہے۔ لیکن قسّام ازل نے شہرتِ دوام کی سند سید علی کے نام لکھ دی

تھی۔ سچ ہے

یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

اعلیٰحضرت غفران مکان

نواب میر محبوب علی خان

اور سانپ کا عمل

ناظرین کرام! التماس ہے کہ ذرا ماضی کے اوراق الٹیے اور اخبار سیاست مورخہ ۹۔ ۱۶ر نومبر اور ۷ر ڈسمبر ۱۹۸۷ء کے "آپ کا کالم" پر دوبارہ ایک نظر ڈالیں۔ بحث یہ تھی کہ اعلیٰحضرت غفران مکان نواب میر محبوب علی خان نظام ششم سانپ کا عمل جانتے تھے یا نہیں اور کیا ان کے نام کی دہائی دینے سے سانپ کا زہر اتر جاتا تھا؟ معتبر اصحاب نے مخالف اور موافق رائے کا اظہار فرمایا۔ نتیجتاً بحث شک و شبہ اور روایتوں کے خار زار میں الجھ کر رہ گئی اور کوئی قطعی فیصلہ نہ ہوسکا۔

نواب منیر الدین خان المخاطب سکندر یار جنگ ثانی سے میرے والد مرحوم قریبی رشتہ داری رکھتے تھے اور ان کے سانپ کے عمل کے کئی واقعات سناتے تھے اور یہ بھی فرماتے تھے کہ یہ عمل صرف ایک ہی آدمی کو سکھانے کا تھا۔ حضور غفران مکان کو اپنا عمل سکھانے سے ان کے خاندان میں عمل نہیں رہا۔ میرا بھی جی چاہا کہ اس بحث میں حصہ لوں لیکن سوچا کہ یہ بات میرے نزدیک معتبر شہادت سہی لیکن تحقیق کی نظر میں ایک روایت ہی ٹھہرتی ہے۔ البتہ "تزک محبوبیہ" میں صاحب تذکرہ نے نواب منیر الدین خان کے حالات لکھتے ہوئے اتنا لکھا ہے "آپ کے پاس ایک عمل سانپ کا ایسا پُر تاثیر ہے کہ جس کی شہرت تمام حیدرآباد و ممالک محروسہ سرکار عالی میں پھیلی ہوئی ہے اور اسی وجہ خاص سے پبلک آپ سے بخوبی واقف ہے"؛ [دفتر اول صـ ۲۳۳]

جب یہ بحث جاری تھی تو میں اس وقت اسٹیٹ آرکائیوز (آندھرا پردیش) میں اعلیحضرت غفران مکان نواب میر محبوب علی خاں کے فرامین دیکھنے میں معروف تھا۔ اتفاق کہئے مجھے اعلیحضرت کا حسب ذیل فرمان ملا۔

اتفاق سمجھئے یا کچھ اور کہ میرے عزیز اور دوست ڈاکٹر داؤد اشرف صاحب کی رہنمائی اور مہربانی سے اسٹیٹ آرکائیوز میں مثل صیغہ فینانس نشان ۱۶۳ بعنوان "اشاعت عمل سانپ" ہمدست ہوئی۔ جو ایک مستند ریکارڈ ہے! اس مثل کا پہلا ورق غفران مکان کے حسب ذیل فرمان سے مزین ہے۔

حویلی قدیم ۱۶ رمضان ۱۳۲۱ھ

مہاراجہ صدرالمہام پیشکار صاحب یمین السلطنت، سکندر یار جنگ بہادر جو اپنے نام سے ایک اعلان جریدہ اعلامیہ میں شائع کرنا چاہتے ہیں ملفوف ہے بمعمولی طور سے جریدہ میں شائع کیا جائے۔ انھوں نے مجھے اپنا عمل دے دیا ہے۔ اس بات کی اطلاع ممالک محروسہ میں جہاں تک ہوسکے ہر جگہ ہر شخص کو ہونے کے واسطے وہ چاہتے ہیں کہ تمام عہدہ داروں کو اس کی اشاعت کرنے کی تاکید کی جائے۔ آپ اپنے طور سے اس کی تاکید عہدہ داروں کو کرا دے سکتے ہیں تاکہ میرے نام سے سب کو فائدہ پہونچ سکے۔

چونکہ خدا تعالیٰ کے فضل و کرم سے عمل ایسا موثر ہے اور اپنا کام ایسا کرتا ہے جیسا کہ تیر از کمان رستہ و سحر عامل کامل اور اس کو میں نے آزمایا بھی ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ یہ خلق اللہ کو ضرور فائدہ بخش ہے اور ہوگا۔

سکندر یار جنگ بہادر کی عرضی مع ملفوفہ جو حال میں آئی وہ بھی ملفوف ہے یکشنبہ ۱۶ ر رمضان المبارک ۱۳۲۱ھ شرح دستخط نواب منیر الدین خاں اپنی جو عرضی جریدہ اعلامیہ میں شائع کرنے کے خواہش مند تھے۔ اور جس کو وہ حضور کی خدمت میں پیش کیا تھا طویل ہے۔ لیکن وہ بہت دل چسپ اور حیرت انگیز بھی ہے۔

بندگان عالی متعالی مدظلہ العالی

اعلان

ممالک محروسہ سرکار عالی اور تمام اقلیم ہند میں عوام الناس آگاہ ہیں کہ راقم السطور محمد منیر الدین خاں سکندر یار جنگ (معتمد پائیگاہ نواب امیر کبیر خورشید جاہ بہادر مرحوم) کے پاس سانپ کا زہر دفع کرنے کا نہایت مجرب عمل مدت سے چلا آتا ہے۔

اگر کسی کو کسی قسم کا بھی سانپ کاٹے تو وہ یا اگر وہ بے ہوش ہو جائے تو اس کے ساتھ کا کوئی بھی آدمی کہدے کہ "تجھے محمد منیر الدین خاں کی قسم دوہائی ہے اُتر جائیں اس کی اطلاع اس قدر عرصہ کے اندر (ایک ہفتہ سے تین سال تک حسب مناسب) محمد منیر الدین خان کو دے دوں گا) تو فوراً زہر کا اثر بفضلہ تعالیٰ دفع ہو جاتا تھا۔ مگر شرط یہ رہی کہ اس واقعہ کی اطلاع مجھے مدت مقررہ کے اندر کسی کی زبانی بالمشافہہ یا اگر سفر دور دراز نہ ہوسکے تو محض بذریعہ تار یا خط دے دی جاتی تھی تاکہ پورے طور سے ہمیشہ کے لیے زہر کا اثر دفع ہوجائے۔ کیونکہ بصورت عدم اطلاع اندرون میعاد زہر کا اثر عود کرآتا تھا۔ اگر اطلاع دہی کے واسطے تار یا خط جو بھی بھیجا جائے وہ گم ہو جائے تو بھی کوئی مضائقہ نہ تھا۔ دہائی دینے والے کے لیے حتی الامکان اطلاع دہی کی شرط پوری کرنا کافی تھا۔

میں نے اکثر ایسا بھی کیا ہے کہ ممالک محروسہ کے متعدد مقامات میں نیم کے جھاڑوں پر اپنا عمل پڑھ کر دم کردیا ہے۔ اور نیز عمل پڑھ کر نیم کے جھاڑ نصب بھی کردیا ہے یا اپنا عمل دم کر کے پانی چند باولیوں میں بھی ڈال دیا ہے۔ جواب تک موجود ہیں۔ اگر کسی کو سانپ کاٹے تو وہ یا اس کی طرف سے کوئی آدمی حسب مذکور میرے نام کی قسم دوہائی دے کر کہہ دے کہ اس قدر مدت کے اندر (ایک ہفتہ سے تین سال تک حسب مناسب) مذکورہ نیم کا پتا یا مذکورہ باؤلی کا پانی پیا جائے گا تو زہر فوراً اُتر جاتا ہے۔ اور مدت

معینہ کے اندر پتا منگا کر متاثر شخص کو کھلانے یا پانی اس باؤلی کا پلانے سے ہمیشہ کے لیے اثر زہر دفع ہو جاتا رہا مجھے اطلاع دینے کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ اور ایسا ہی کسی نیم کے جھاڑ کی لکڑی پر اس کا پوست نکال کر میرا عمل دم کیا جائے تو اس کا صندل چٹانے اور زخم پر لگانے سے بھی زہر دفع ہو جاتا رہا۔

میرے عمل کا یہ بھی خاصہ ہے کہ اگر عامل اپنا عمل کسی کو بتا دے اور سکھا دے تو عمل کی تاثیر منتقل ہو جاتی ہے یعنی سکھانے والے کے پاس عمل نہیں رہتا۔ تمام وکمال سیکھنے والے کو حاصل ہو جاتا ہے۔

میں نے اپنے اس عمل کو بغرض رفاہ عام اپنے آقائے ولی نعمت اعلیٰحضرت نواب میر محبوب علی خان بہادر خلد اللہ ملکہٗ کو بتا دیا اور سکھا دیا ہے اعلیٰحضرت کو میں نے یہ عمل اپنی خوشی ورضامندی سے بخش دیا ہے۔ بس اب یہ عمل میرے پاس نہ رہا۔ اعلیٰحضرت کو تمام وکمال حاصل ہو چکا ہے اور اعلیٰحضرت نے اس کا امتحان بھی کر لیا ہے۔ لہٰذا میں بنظر حفاظت نفوس خلائق بذریعہ ہذا اعلان کرتا ہوں کہ آئندہ سے اس عمل کی نسبت قسم ودہائی میرے نام سے نہ دی جائے بلکہ میرے نام کے عوض اعلیٰحضرت خلد اللہ ملکہٗ کے نام (میر محبوب علی خان بہادر کی قسم ودہائی دی جائے یعنے دیکھے میر محبوب علیخاں کی قسم ودہائی ہے) کہا جائے۔ تو انشاء اللہ تعالیٰ وہی تاثیر بفضل الٰہی ہوگی جو اب تک میرے نام لینے سے ہوتی رہی۔

میں نے اپنا یہ مشہور عمل اب تک کسی کو نہ دیا اور اب اعلیٰ حضرت کو میری خوشی ورضامندی سے اس لیے دے دیا ہے کہ اعلیٰحضرت مرجع عالم ہیں۔ جن سے ہر قسم کا فیض ہزارہا خلق اللہ کو پہونچتا رہا ہے۔ اور ان ہی سے اس عمل کا فیض بھی عامہ خلائق کو حاصل ہونا میری دانست میں نہایت اولیٰ و انسب پایا گیا: تاکہ وہ اس عمل کا فیض خلائق کو پہونچا کر عند اللہ ماجور اور عند الناس مشکور ہوں۔

آئندہ میرے نام کی دہائی یا قسم سانپ کاٹے کو دینے یا مجھے اطلاع دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ قسم و دہائی اعلحضرت کے نام نامی میر محبوب علیخاں کی دی جائے اور ان ہی کو واقعہ کی اطلاع بھی دی جائے۔ اعلحضرت نے بمراحم خسروانہ یہ انتظام فرمایا ہے اطلاع کے تار یا خط برابران کے بعدست ہوں اس کام کے واسطے اعلیٰ حضرت نے اپنے ایڈیکانگ محمد معین الدین خاں نامر نواز الدولہ بہادر کو مقرر فرمایا ہے۔ اور تاکید فرمادی ہے کہ تار یا خط حسب مذکورہ صاحب کے پاس بھیجے جایا کریں اور دلوڑھی مبارک کے چوبداروں کو بھی تاکید فرمادی گئی ہے جہاں سواری مبارک رونق افروز ہو وہاں جس وقت شب میں ہو یا دن میں جو کوئی سانپ کاٹے ہوئے کی اطلاع یا کیفیت لائے وہ فوراً اس وقت سمع ہمایونی تک پہونچادی جائے۔

(INT 77 - فناس (IST 3) SM - 420

مذکورہ اعلان حسب خواہش نواب محمد منیر الدین خاں سکندر یار جنگ ثانی اور بموجب فرمان اعلیحضرت غفران مکان نواب میر محبوب علی خان جریدہ میں شائع نہیں کیا گیا۔ اب اٹھیاسی (۸۸) سال بعد یہ اعلان شائع ہو رہا ہے جو مبنی بر حقیقت ہے ایک سند ہے۔ ایک ریکارڈ ہے۔

متذکرہ بالا فرمان اور اعلان سے اب یہ مسئلہ شک وشبہ سے بالا تر ہو گیا ہے کہ اعلیحضرت غفران مکان نواب میر محبوب علیخاں سانپ کا عمل جانتے تھے اور آپ کے نام کی دہائی دینے سے سانپ کے زہر کا اثر زائل ہو جاتا تھا۔

وکٹوریہ زنانہ اسپتال
کی
تقریب تنصیب سنگِ بنیاد

رود موسیٰ کے کنارے بجانب جنوب کسی زمانے میں سلطان محمد قلی قطب شاہ کے وزیر مرزا محمد امین اصفہانی امین الملک میر جملہ کا ایک باغ تھا جو "امین باغ" کے نام سے مشہور رہا۔ مرور زمانہ کے سبب باغ کے آثار تو باقی نہیں رہے البتہ اس کا نام برقرار ہے۔ اسی باغ کے وسیع خطہ پر وکٹوریہ زنانہ اسپتال واقع ہے جس کی تقریب تنصیب سنگ بنیاد تاریخ کا ایک یادگار واقعہ ہے۔

یہ اپنی نوعیت کا پہلا دواخانہ ہے جو بعہد اعلیٰحضرت غفران مکان نواب میر محبوب علیخان آصف جاہ سادس بلالحاظ مذہب و ملت طبقہ نسواں، پردہ نشین خواتین کے لیے قابل و ماہر لیڈی ڈاکٹروں کے ذریعہ ہر طرح کے زنانی علاج معالجہ اور زچگی کی سہولت بہم پہونچانے کی غرض سے معرض وجود میں آیا جس کی کوئی نظیر سلاطین سلف کے کسی زمانہ میں نہیں ملتی۔ جب اس عالیشان دواخانہ کے ابتدائی مراحل طے ہو گئے تو اس کا سنگِ بنیاد بھی طبقہ نسواں ہی کی ایک ذی مرتبت شخصیت شہزادی ویلز وکٹوریہ میری کے دست خاص سے رکھا گیا۔ اس خصوص میں ایک شاہی تقریب منعقد کی گئی تھی جس کی یہ خصوصیت قابلِ ذکر ہے کہ اس میں جہاں امرائے دست اور اعیان حکومت و عمائد سلطنت کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی معزز خواتین کو بھی شرکت کے لیے مدعو کیا گیا تھا جن کے لیے جلسہ گاہ کے قریب ایک علیحدہ خیمہ میں نشست کا نہایت سہولت بخش انتظام تھا۔

یہ اب سے کوئی چوراسی ۸۴ سال پہلے سنہ ۱۹۰۶ء کی بات ہے کہ ولی عہد برطانیہ شہزادہ ویلز (جو بعد میں بادشاہ ہو کر ہز مجسٹی جارج پنجم کہلائے) اور ان کی

دورہ پر ہندوستان آئے تھے اور اوائل فروری میں ان کے حیدرآباد آنے کا
پروگرام تھا جہاں انکے شاندار استقبال کی تیاریاں کی گئی تھیں۔ شہر کو ہر طرح
آراستہ و پیراستہ کیا گیا اور قصر فلک نما کی تزئین و آرائش کی گئی جہاں پہلی
مرتبہ شاہی مہمان کے قیام و استراحت کا انتظام و اہتمام کیا گیا تھا اس کے
بعد سے اس قصر شاہی کو مہمان خانہ شاہی کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ ۸ر فروری
۱۹۰۶ء کو شہزادہ و شہزادی ویلز وارد حیدرآباد ہوئے۔ ان کا شاندار اور
پُرتپاک استقبال کیا گیا۔ اس کے دوسرے ہی دن ۹ر فروری کو وکٹوریہ زنانہ
اسپتال کی تقریب تنصیب سنگ بنیاد شام کے پانچ بجے منعقد ہونے کا پروگرام
تھا اور صبح کو سکندرآباد گراونڈ پر فوجی پریڈ کے معائنہ کا پروگرام تھا چنانچہ اعلحضرت
غفران مکان شہزادہ کی معیت میں سکندرآباد گراونڈ پر رونق افروز ہوئے
اور فوجی پریڈ شروع ہوئی۔ اس اثنا میں یہ افسوسناک و الم انگیز اطلاع سمع ہمایونی
کو پہنچی کہ جوان سال و عزیز ترین بڑی صاحبزادی نظام النساء بیگم رحلت کر گئیں
جو مرض دق میں مبتلا تھیں۔ اس لمحہ سواری شاہانہ مراجعت فرمائے قصر شاہی ہوئی
شہزادہ ویلز نے اپنے ہاتھ سے تعزیت نامہ لکھ کر پیشگاہ خسروی میں گزرانا اور
شہزادی جو اس المناک واقعہ سے خود بھی بہت متاثر ہوئیں حرم سرائے شاہی
میں پہنچ کر مراسم تعزیت ادا کئے۔ سارا شہر شاہ ذیجاہ کے غم میں شریک رہا۔
ہر طرف ایک اداسی پھیل گئی۔ قصر فلک نما سے رزیڈنسی تک گزرگاہوں پر رنگ
برنگ روشنی کا شاندار انتظام کیا گیا تھا احتراماً موقوف رہا۔ تمام سرکاری
مصروفیات شاہزادی مرحومہ کے سوگ میں ممنوع کردی گئیں لیکن وکٹوریہ
زنانہ اسپتل کی تنصیب سنگ بنیاد کی تقریب رفاہ عامہ کے پیش نظر سے
بڑی اہمیت کی حامل تھی اس لیے طبع شاہانہ کو اس کی موقوفی یا منسوخی گوارا
نہ ہوئی چنانچہ یہ تقریب وقت مقررہ پر بڑی شان و اہتمام سے منعقد ہوئی۔
حسب پروگرام شاہزادہ و شاہزادی ویلز، رزیڈنٹ بہادر، جمیع انگریز
عہدیدار، فوجی افسر وغیرہ ٹھیک وقت پر امین باغ پہنچ گئے۔ البتہ حضور

پُرنور، مدارالمہام، امراء و اعیان سلطنت نے شرکت نہیں کی کہ عین اُس وقت مکہ مسجد میں جہاں شاہی مقبرہ واقع ہے شہزادی مرحومہ کے آخری مراسم تجہیز و تکفین انجام پذیر تھے۔ جلسہ گاہ میں جب سب مہمان اور مدعوئین اپنی اپنی نشستوں پر متمکن ہو گئے تو تقریب کا یوں آغاز ہوا کہ رزیڈنٹ بہادر نے ہز رائیل ہائینس شہزادی ویلز سے آغاز کارروائی کی اجازت چاہی۔ سب سے پہلے ڈاکٹر گملٹ ناظم طبابت سرکار عالی نے اپنی تحریری تقریر سُنائی جس میں زنانہ اسپتال کی ضرورت اور اس کے انتظامات کے بارے میں اپنے خیال و آراء کا اظہار کیا۔ بعد ازآں رزیڈنٹ بہادر اعلیٰ حضرت غفران مکان کی نمائندگی کرتے ہوئے تقریر شاہانہ سُنانے کی عزت حاصل کی جس میں زنانہ اسپتال کی ضرورت و اہمیت جتاتے ہوئے آنجہانی ملکہ معظمہ وکٹوریہ قیصرہ ہند کی یادگار میں شہزادی سے دواخانہ کا سنگ بُنیاد رکھنے کی خواہش فرمائی گئی تھی۔ شہزادی وکٹوریہ میری نے اپنی جوابی تقریر میں اس پر اظہارِ خوشنودی کرکے توقع ظاہر کی کہ اس دواخانہ کے قیام سے مستورات کو بہت فائدہ پہونچے گا۔ صاحب تالیف "سیر حیدرآباد" نے اس تقریب کا ذِکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"بعد ازاں بنیادی پتھر رکھنے کی رسم ادا کی گئی۔ اول بنیاد میں ایک نقرئی باکس (جس میں اخبار پائنیر، جریدہ اعلامیہ اور مشیر دکن و نیز حیدرآباد کے چند طلائی و نقرئی سکے بند تھے) رکھا گیا اور اس پر شہزادی صاحبہ نے اپنے دست خاص سے پتھر نصب فرمایا۔ کرنی اور چونا رکھنے طشت نقرئی تھا۔" (ص ۱۵۵)

تنصیب سنگ بنیاد کی رسم کے بعد ڈاکٹر گملٹ نے سرکاری اور دیگر ڈاکٹروں کا پرنس سے تعارف کرایا۔ اس موقع پر شہزادی میری نے پردہ دار خواتین کے خیمہ میں جاکر انھیں شرف تکلم بخشا اور بات چیت کی اس کارروائی کے بعد جلسہ برخاست ہوگیا اور پرنس اور پرنسس قصر فلک نما واپس ہوئے۔

اسی روز رات میں بجانب رزیڈنٹ بہادر معزز مہمانوں کا رزیڈنسی

میں ڈنر تھا جس میں پرنس اور پرنسس شریک ہوئے لیکن اعلیٰ حضرت غفران مکان نے شرکت نہیں فرمائی اور حکومت کے مدعوئین امراء اور عہدہ دار بھی ڈنر میں شریک نہیں ہوئے۔ رزیڈنسی میں اس حد تک غم کی پاسداری کی گئی کہ روشنی صرف گیٹ سے کوٹھی کے اندر تک محدود رہی۔

آج بھی دواخانہ کی قدیم عمارت کی بائیں جانب ابتداء میں یہ یادگار سنگِ بنیاد موجود ہے جس پر حسب ذیل تحریر کندہ ہے؛

This Stone Was Laid by Her Royal Highness The Princess of Wales on The 9th February 1906

وکٹوریہ زنانہ اسپتال کا نام اب "گورنمنٹ میٹرنٹی ہاسپٹل" سے بدل دیا گیا ہے جس سے اس دواخانہ کی تاریخی عظمت اور اس کی خصوصی نوعیت کا اظہار نہیں ہوتا۔ نام بدل دینے سے تاریخی حقیقتیں تو نہیں بدل جاتیں حقوق نسواں کی تحریکیں مشرق و مغرب میں زور و شور سے جاری ہیں لیکن کیا طبقہ نسواں کی فطری شرم و حیا کے پاس و لحاظ کا ایسا عملی نمونہ کہیں ملتا ہے۔

حضور نظام کی اقتدا میں نماز

دیدو شنید کہانی — قلم میرا ان کی زبانی

آج سے کوئی ۶۶ سال پہلے سنہ ۱۳۴۳ھ میں اعلیحضرت خسرو دکن آصف سابع کے خاص فرمان سے باغ عامہ کی مسجد نئی نئی تعمیر ہوئی تھی۔ جمعہ کی نماز اعلیحضرت مع شہزادوں کے بالالتزام یہیں ادا فرمایا کرتے تھے۔ دور دراز محلوں سے بھی بکثرت لوگ جمعہ کی نماز اعلیحضرت کے ساتھ ادا کرتے تھے۔ باقی نمازوں میں معدودے چند مصلی ہوتے تھے۔ ایک روز مغرب کی نماز کا وقت شروع ہونے میں کچھ دیر باقی تھی مسجد میں تین چار نمازی جمع تھے کہ دفعتہً پولیس کی سیٹیوں

کی گونج میں سواری شاہانہ مسجد کے سامنے سڑک پر جلوہ افروز ہوئی۔ نواب
سرامین جنگ صدرالمہام پیشی مبارک ہمرکاب تھے سرکار والا تبار خراماں خراماں
مسجد میں داخل ہوئے۔ امین جنگ کو شرف تکلم بخشتے ہوئے مسجد کی خوشنمائی
کی تعریف فرماتے رہے۔ ادھر مغرب کی نماز کا وقت قریب سے قریب
تر آگیا۔ اتفاق سے امام صاحب بھی ندارد تھے۔ موذن صاحب لوکھلائے ہوئے
انھیں تلاش کرنے لگے مگر ان کا پتہ نہ تھا۔ موذن صاحب کی پریشانی کو دیکھ
کر حضور پرنور نے اپنے خاص لہجہ میں موذن کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا کہ
امام نہیں ہے تو کیا نماز نہیں ہوگی؟ یہ کچھ کرسٹانوں کا مذہب نہیں ہے کہ پادری
ہی نماز پڑھائے دوسرا کوئی نہیں پڑھا سکتا۔ اذاں دے دی جائے نماز ہم میں سے
کوئی پڑھا دے گا۔ پھر اذان ہوئی۔ حضور عالی نے نواب سرامین جنگ کو اشارہ
کیا کہ وہ نماز پڑھائیں کہ وہ ایک متشرع شخص تھے۔ چہرہ پر داڑھی خاصی اچھی
تھی۔ نواب صاحب نے دست بستہ نہایت ادب سے عرض کیا کہ سرکار! امامت
بادشاہ اسلام کا فریضہ ہے۔ کیا ہی اچھا ہوگا کہ سرکار امامت فرمائیں، ہم سب
خدام کو سرکار کی اقتداء میں نماز پڑھنے کا شرف حاصل ہوگا۔ اس پر ارشاد

نماز میں اعلحضرت کا ادب سے کھڑے رہنا، آواز میں خشیت اور ارکان نماز کو سنبھل سنبھل کر ادا کرنا ان کی خاص ادا تھی۔ ذات شاہانہ کے تعلق سے یہ اپنی نوعیت کا ایک منفرد واقعہ تھا جس کی اہمیت نظرانداز نہیں کی جا سکتی۔ مگر یہ نہ تو کسی مقامی اخبار میں شائع ہوا نہ عوام و خواص میں اس کا شہرہ ہوا۔ بس چند آدمیوں کے حافظہ میں محفوظ رہا۔

نواب ولی الدولہ بہادر کا سفر حج

دید و شنید کہانی۔ قلم میرا اُن کی زبانی

نواب ولی الدولہ بہادر حیدرآباد کے نامور امراء میں شمار ہوتے تھے۔ کھوں روپے سالانہ جاگیر تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ خانوادۂ شاہی سے قرابت کا شرف حاصل تھا۔ حکومت سرکار عالی کے دور میں صدر المہام تعلیمات و کے اعلیٰ عہدہ پر فائز تھے۔ مے نوشی و عیش کوشی اس زمانہ میں کئی امراء ول طبقہ کا وطیرہ تھا۔ نواب صاحب کے یہاں اقسام کی قیمتی شراب کا وافر رہ تھا باایں ہمہ نواب صاحب میں دینداری تھی۔ سلسلۂ ابوالعلائیہ کے ایک کامل سے بیعت تھے۔ اس کو جاذبہ توفیق الٰہی کا کرشمہ کہیئے یا شیخ طریقت کا توجہ سمجھیئے نواب صاحب میں یکایک حج بیت اللہ کا داعیہ پیدا ہوا۔ وہ ے منکرات و محرمات سے تائب ہوئے۔ شراب کا سارا ذخیرہ پانی کی دیا اور شراب کے تمام شیشے اور برتن توڑ دیئے اور اپنے مقدس سفر پر ے۔ نواب صاحب کو وداع کرنے کے لیے ریلوے اسٹیشن حیدرآباد امراء نیز دوست احباب کا ایک جم غفیر تھا۔ مہاراجہ کشن پرشاد ان قریب تھے۔ جب ریل میں نواب صاحب سوار ہونے کو تھے مہاراجہ کا مشہور شعر جو ایسے موقعوں پر عام طور پڑھتے ہیں پڑھنا چاہا۔ ایک مصرعہ سفر کردنت مبارک باد" پڑھا تھا کہ نواب ولی الدولہ نے جھٹ سے

اپنا ہاتھ مہاراجہ کے منہ پر رکھدیا اور کہاکہ آگے ہمت پڑھیئے۔ اس کا دوسرا مصرعہ تھا "بسلامت روی و باز آئی"! غرض کہ نواب صاحب حیدرآباد سے روانہ ہوکر مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔ عمرہ ادا کیا اور سیدھے مدینہ مبارکہ حاضر ہوکر روضۂ اقدس کی والہانہ زیارت کی۔ کیا عرض و نیاز ہوئے اللہ ہی کو علم ہے۔ اور ابھی ایام حج شروع نہیں ہوئے تھے کہ نواب صاحب رحلت کر گئے اور جنت البقیع میں پیوند زمین ہوئے۔ قبر ان کی خاتون جنت حضرت سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کی مرقد مطہرہ کے پائنتی میں ہے۔ لوح مزار پر صرف ولی الدولہ کندہ تھا۔ ایک مدت بعد یہ لوح مزار غائب ہو گئی۔ حیدرآباد میں جب انتقال کی خبر پہنچی تو ان کے تحت دفاتر کو تعطیل دے دی گئی چنانچہ تمام مدارس کو اسی وقت چھٹی دے دی گئی۔

حیدرآباد کے تاریخی واقعات شاعری میں

جناب عمر خالدی صاحب فرزند محترم ابوالنصر محمد خالدی صاحب مرحوم سابق استاذ تاریخ اسلام جامعہ عثمانیہ ابھی چند دن پہلے امریکہ (بوسٹن) سے اپنی والدہ محترمہ کی قدم بوسی اور اپنے دوست و احباب سے ملاقات کی غرض سے اپنے وطن حیدرآباد مختصر قیام کے لیے آئے ہوئے ہیں۔ موصوف کو تاریخ کا ذوق اور تحقیق کا جذبہ اپنے والد مرحوم سے ورثہ میں ملا ہے۔ امریکہ میں رہتے ہوئے اپنے وطن عزیز حیدرآباد کی تاریخ یہاں کے آثار اور روایات سے ایسا والہانہ عشق ہے کہ انھوں نے کئی بیش بہا محققانہ مقالے اور مضامین لکھے ہیں جو کتابی صورت میں زیور طبع سے آراستہ بھی ہوئے۔ اگرچہ قیام عارضی اور مختصر ہے لیکن اپنے لمحات کو سیر و تفریح اور نشاط انگیز محفلوں میں ضائع کئے بغیر اپنے آپ کو تحقیقی کاموں

میں رات دن مصروف رکھے ہوئے ہیں۔

اخبار سیاست مورخہ ۱۵ر جولائی کی اشاعت میں بعنوان مندرجہ بالا ان کا بہت دلچسپ اور تاریخی مضمون شائع ہوا ہے۔ یقیناً یہ اشعار ہماری شاعری کا یادگار سرمایہ ہیں۔ اگرچہ شاعر کا لب ولہجہ جذبات کے اظہار میں بہت تیز وتند ہے اور اسی لیے شاید بعض طبائع نازک پر گراں گزریں لیکن فردوسی طوسی نے اپنے طبقہ شعراء کی خوب وکالت کی ہے:

چون شاعر بہ رنجد بگوید ہجا
بماند ہجا تا قیامت بجا

جناب عمر خالدی صاحب کا مضمون دیکھ کر میں نے بھی ماضی کے چند گم شدہ اوراق الٹنے کی کوشش کی ہے:

[۱] اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علی خاں آصف سابع بحیثیت بادشاہ پہلے پہل ۱۹۱۱ء ملک معظم (برطانیہ) کے جشن تاجپوشی میں شرکت کے لیے دلی تشریف لے گئے تھے رعایا کی خواہش تھی کہ بادشاہ کو اس جشن میں کامل اختیارات اور اعلیٰ سے اعلیٰ خطابات ملیں۔ شاعر نے اپنے شعر میں ان ہی خواہشات کی ترجمانی کی تھی۔

ہز مجسٹی بن کے اب سرکار دلی سے پھریں
تاجِ شاہی پہنیں جشن تاجپوشی سے پھریں

اعلیٰ حضرت آصف سابع تخت نشین ہونے کے بعد حکومت برطانیہ سے اپنے حقوق منوانے اور غصب کئے ہوئے علاقے واپس لینے کے لیے سلسلہ جنبانی شروع کر دی چنانچہ رزیڈنسی کا علاقہ، ملک برار اور مچھلی بندر کے حصول کے لیے برٹش گورنمنٹ سے جرأت مندانہ گفتگو کا آغاز کر دیا۔ رزیڈنسی کا علاقہ چند محلوں پر مشتمل تھا۔ اس علاقے پر انگریز رزیڈنٹ کا اقتدار ناواجبی اور غیر قانونی تھا۔ برٹش گورنمنٹ نے بالآخر حضور نظام کے ادعا کو تسلیم کرتے ہوئے سو سال بعد [۱۹۳۳ء] یہ علاقہ حضور نظام کے حوالے کیا۔ ایک شاعر نے اس واقعہ کا

ذکر یوں کیا ہے :

خدا کا شکر ہے ہاتھ آگئی رزیڈنسی
برار کے لیئے زینہ ملا رسائی کا

[۲] وسط ہند کے زرخیز خطہ صوبہ برار کو نواب ناصر الدولہ نے ۱۸۵۳ء میں گنشتجنٹ کے قرض کی ادائی میں حکومت برطانیہ کے حوالے کیا تھا۔ لیکن انگریزوں نے اس پہ اپنا اقتدار جمالیا۔ شاہان آصفیہ نے ملک برار کی واپسی کے لیے بڑی کوششیں کیں لیکن حکومت برطانیہ نے ٹال مٹول کی پالیسی اپنائی اور آخرکار برار کو واپس کرنے سے انکار کردیا۔ حضور نظام نواب میر عثمان علی خان نے بڑی حوصلہ مندی سے معاہدہ برار کا مسئلہ اُٹھاتے ہوئے اسے اپنی مملکت کا جزء لاینفک قرار دیا۔ برٹش گورنمنٹ سے بات چیت کے لیے اپنی حکومت کے اعلیٰ عہدہ دار سر اکبر حیدری کو مقرر کیا۔ سر اکبر حیدری نہایت لائق اور سیاسی شخص تھے لیکن انگریزوں کی ڈپلومیسی اور مکارانہ سیاست کی وجہ ان کا مشن ناکام ہوگیا البتہ صرف اس حد تک کامیابی ہوئی کہ برٹش گورنمنٹ نے نظام کو ملک برار کا بادشاہ تسلیم کیا اور ولی عہد نواب اعظم جاہ کو "پرنس آف برار" کا لقب اختیار کرنے کی اجازت ملی۔ یہ بھی طے پایا کہ ایک عہدہ دار حکومت حیدرآباد کی جانب سے برار میں ایجنٹ برار کے نام سے مقیم رہے گا۔ تاریخ میں اس معاہدہ کو "استرادِ برار" کے نام سے یاد کرتے ہیں حالانکہ ملک برار کا سارا انتظام حکومت برطانیہ نے اپنے ہاتھ میں رکھا تھا حیدرآباد میں ایک طبقہ نے سر اکبر حیدری کی اس کارگزاری کو سراہا لیکن ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو انھیں انگریزوں کا ایجنٹ قرار دے کر ان کی مخالفت کی۔ ایک جلسہ بھی حیدرآباد میں ہوا۔ بعض اشخاص نے سر اکبر حیدری کے خلاف نظمیں لکھیں اور ان کو جلسہ میں تقسیم کیا مگر پولیس والوں نے ان پرچوں کو چھین لیا۔ ان نظموں کے چند شعر پیش ہیں جن میں شاعر نے اپنے جذبات کی عکاسی کی ہے :

زبانِ خلق

[۱]

ہوگئی اب یہ حقیقت آشکار حیدری نے کھو دیا ملک برار
ایسی شاہی سے فقیری ہی بھلی بادشاہت ہے مگر بے اختیار
کیا یہی سننے کے تھے ہم منتظر کیا اسی دن کے لئے تھے بے قرار
جو گیا ہے ہاتھ سے وہ تو گیا ہے جو باقی اس سے رہئے ہوشیار
گر وفاق آیا تو سمجھو سب گیا دولت و جاہ و حشم عز و وقار
آکے فیڈریشن تباہی لائے گا ملک کے دشمن خدا کی تجھ پہ مار
تو دکن کی سلطنت کھونے کو ہے
میر صادق دوسرا ہونے کو ہے

[۲]

ترے فریب وفا سے واقف ہیں ہم کو مژدہ سنانے والے
بلا ہے کس کو برار ناداں یہاں کوئی بے خبر نہیں ہے
وفا فروشی میں طاق نکلا بڑا ہی چوبند و چاق نکلا
عدو کو اس کا یقیں ہی تھا کہ حیدری بے ہنر نہیں ہے
تو اپنی سازش کی کامیابی پہ شاد و مسرور ہو رہا ہے
ہوں کیسے مسرور ہم دکن میں وطن کا قلب و جگر نہیں ہے
لگا رکھا ہے اک اور پھندا یہ پُر خطر ہے وفاقی دھندا
دکن کی عظمت کے پاسبانو تمہاری یہ رہ گزر نہیں ہے
یہ پارسائی یہ خضر صورت پھر ایسے کرتوت اللہ اللہ
یقین ہے اب تو ہمصفیرو کہ حیدری راہ بر نہیں ہے

(۳) سر علی امام (مؤید الملک) پٹنہ کے متوطن تھے جب حضور نظام نواب میر عثمان علیخان نے کابینی نظام قائم کیا تو سر علی امام کے خدمات برٹش گورنمنٹ سے حاصل کئے اور انھیں کابینی نظام کا پہلا صدر اعظم بنایا۔ وہ ایک لائق سیاستدان

اور قابل اڈمنسٹیٹر تھے۔ ایک عرصہ سے حیدرآباد میں ملکی اور غیر ملکی کا چکر چل رہا تھا اگرچہ سر علی امام نے ملک کی ترقی کے کارآمد اسکیمات بنائیں لیکن ان کی اصول پرستی رنگ لائی اور انھیں حیدرآباد چھوڑنا پڑا۔ ان کی واپسی پر حیدرآباد کے کسی ضلع کے ایک دل جلے شاعر نے آٹھ قطعات لکھے تھے:

[۱] حیدرآباد دکن میں اس سال — ہوئی شادی عجب محرم میں
ہر بشر کی زبان پہ ہے یہ سخن — صدر اعظم گئے جہنم میں

[۲] صدر اعظم سے حکومت چھن گئی — حیدرآباد دکن میں غل ہوا
عدل کی قندیل پھر روشن ہوئی — اور چراغ ظلم آخر گل ہوا

[۳] حیدرآباد سے سوئے پٹنہ — جس گھڑی سر علی امام گئے
غیر ملکی ہوئے بہت غمگین — بولے ملکی نمک حرام گئے

[۴] ملک میں آئی تھی بلا کالی — جس نے چھینی تھی اس کی خوشحالی
ہوگیا آخر اس کا استیصال — بطفیل شہ ہمایوں فال

[۵] علی امام نے کھولا تھا ظلم کا دفتر — ذلیل وخوار کیا ملکیوں کو چن چن کر
لٹایا یاروں پہ اپنے خزانۂ شاہی — نہ ان کو خوف خدا تھا نہ آخرت کا ڈر

[۶] شمالی ہند سے نالائقوں کو بلوایا — اور ان کو عہدے دیئے ذمہ داری کے اکثر
نکالا ملکیوں کو یا کہ سخت تنگ کیا — تلف حقوق کیئے ان کے بے ہراس و خطر

[۷] رعایا فاقوں سے مرتی تھی قحط سالی میں — مگر تھا عیش کا سامان علی امام کے گھر
غلو ہوا انھیں ناراستی میں اس درجہ — زمین ملک کی غیروں کو بخشی بلوا کر

[۸] تھے غیر ملکی پہ پایا خطاب ملکی کا — نتیجہ یہ ہوا کہ ہوگئے وہ ملک بدر
غرض یہ حال تھا ان کا کہ اپنے دادا کی — پڑھی تھی فاتحہ حلوائی جی کی دکان پر

ہمارے آقا سلامت رہیں ہزار برس
ہزار آئیں گے اور ہوں گے ایسے ملک بدر
آمین

مولوی محمد علی صدر ناظم پولیس اضلاع نے معتمد پیشی نواب اظہر جنگ کو اپنے خط کے ساتھ یہ قطعات بھجوائے اور انھوں نے ان قطعات کو حضور نظام کے

ملاحظہ میں پیش کر دیئے۔ اعلیٰ حضرت ان اشعار کو دیکھ کر بہت برافروختہ ہوئے اور حکم دیا کہ "اس بارے میں اول مددگار کوتوالی ونکٹ راما ریڈی و ناظم پولیس اضلاع کو میں نے بالمشافہہ حکم دیا ہے کہ دونوں مل کر اپنے حدود میں پتہ لگائیں کہ ان اشعار کا لکھنے والا کون ہے اور یہ اشعار کس مطبع میں شائع ہوئے ہیں یا نہیں اور جس صورت میں لکھنے والے یا والوں کا پتہ معلوم ہو جائے تو ان کو زیرِ حراست لے کر مجھے اطلاع دی جائے تاکہ اس بارے میں حکم مناسب صادر ہو سکے اور آئندہ دوسروں کو ایسے حرکات کرنے کی جرأت نہ ہو۔"

شرح دستخط

۱۴ / محرم الحرام ۱۳۴۱ھ

ان اشعار کے لکھنے والے شاعر کا نام معلوم ہوا نہ کہیں اس کا پتہ چلا لیکن اس کے قطعات آج بھی آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز کے ریکارڈ قسط نمبر [۸۰] لسٹ نمبر (۲) اور نشان سلسلہ نمبر (۶۵) پر باقی و محفوظ ہیں۔

[۴] سر اکبر حیدری صدارتِ عظمیٰ سے وظیفہ پر علیحدہ ہوئے اور ان کی جگہ سنہ ۱۹۴۱ء میں حافظ احمد سعید خان نواب چھتاری صدر اعظم حکومت حیدرآباد ہوئے مشہور ہے کہ چڑھتے سورج کی پوجا ہوتی ہے ڈوبتے سورج کی نہیں یوں بھی کسی شاعر کی ترقی کے لیے اس کے عرض معروضہ کی کوئی شنوائی سر اکبر حیدری نے نہیں کی تھی اس لیے نئے صدر اعظم کی آمد کی تہنیت میں جو اشعار شاعر [صدق جائسی] نے لکھے وہ اس کے چوٹ کھائے ہوئے دل کی پکار ہے۔

قطعہ

اک دن کسی ملکی نے اک آزاد سے پوچھا آں شوم کہ دی حاکم ما بود مگر رفت
اب عادل و باذل کی حکومت کے ہیں ڈنکے آں حاکم اول بہ سفر یا بہ سقر رفت
آزاد تو آزاد تھے بے ساختہ بولے ما را چہ ازیں قصہ کہ گاؤ آمد و خر رفت
ملکی نے کہا اٹھ کے کہ یہ ارشاد ہے بیجا سال است و ہمیں فالِ کہ خیر آمد و شر رفت

[۵] پولیس ایکشن سنہ ۱۹۴۸ء سے پہلے اخبار "وقت" حیدرآباد دکن کا ایک مقبول عام اردو اخبار تھا۔ دراصل اس دور کے مجلس اتحاد المسلمین کا نمائندہ

روزنامہ تھا اس کے ایڈیٹر جناب عبدالرحمن رئیس صاحب بڑے بے باک اور جذباتی ایڈیٹر تھے کارپرداز ان حکومت کو بھی تنقید کا نشانہ بنانے نہیں چوکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت نے اخبار وقت بند کر دینے کے احکام جاری کر دیئے۔ لیکن مجلس کی نمائندگی اور کچھ عوامی مطالعہ پر چند ماہ بعد دوبارہ اخبار وقت کی اجرائی کے احکام دیئے گئے اس خوشی میں ایک بڑا جلسہ منعقد ہوا تھا۔ اس جلسہ میں دکنی زبان کے مقبول شاعر جناب نذیر دہقانی نے ایک رباعی سنائی تھی جو چالیس سال گزرنے کے بعد بھی میرے حافظہ میں محفوظ ہے۔ بے شک گیا وقت ہاتھ آتا نہیں لیکن نذیر دہقانی نے جس سادگی و پرکاری سے بات میں بات نکالی ہے وہ قابل داد ہے:

قدر کرو وقت کی انسان بنا دیتا ہے
وقت سوئی ہوئی قسمت کو جگا دیتا ہے
وقت یہ وہ نہیں دہقانی نہ آئے جا کو
لاکھ کوشش کرو وہ آکو دکھا دیتا ہے

بیرونی مشاہیر ادب اور حیدرآباد

تاریخ شاہد ہے کہ شاہان وقت، روسا اور امراء نے ہمیشہ بلا لحاظ مذہب و ملت علماء، شعرا اور فنکاروں کی بڑی قدردانی اور سرپرستی کی ہے۔ ان کے اِن ہی کارناموں کے نقوش تاریخ کے صفحات پر مرقسم ہیں۔ مغلیہ دور کے بعد عادل شاہی، برید شاہی، نظام شاہی، قطب شاہی بادشاہوں اور وجیانگر کے راجاؤں نے بھی علم و فن کی ترقی میں جس فراخ دلی سے حصّہ لیا ہے اس کی روداد تواریخ اور شعرا کے قصیدوں میں محفوظ ہے۔

غور طلب اور تعجب کی بات یہ ہے کہ دکن کی مذکورہ بالا بادشاہتیں صدیوں بڑی شان و شوکت سے قائم رہنے کے باوجود ان کے دفاتر کا کوئی

اور وہی ریکارڈ دستیاب نہیں ہے جس کی وجہ سے بعض خودساختہ
اور مضحکہ خیز واقعات جو دماغی اختراع کے سوا کچھ نہیں بادشاہوں
سے منسوب کر دیئے گئے ہیں جن سے اس دور کی تاریخیں خالی ہیں۔
مملکت آصفیہ حیدرآباد سابق میں برصغیر کی سب سے بڑی اور ترقی یافتہ
ریاست تھی۔ علم و ادب کی سرپرستی اس کا طرۂ امتیاز تھا۔ مشاہیر علم و فن
ہندوستان سے کھنچ کھنچ کر حیدرآباد آتے اور تاجداران آصفیہ کی علمی
معارف نوازی سے مشرف اور فکرِ معاش سے مطمئن ہوکر گراں قدر
تصنیفات میں مشغول رہتے تھے۔ جن کی شہرہ آفاق تصانیف سے ایک
عالم مستفید ہو رہا ہے۔
اعلیٰ حضرت غفران مکان نواب میر محبوب علیخان آصف سادس اور اعلیٰحضرت
میر عثمان علیخان آصف سابع نے نہ صرف ان شاندار روایات کو برقرار
رکھا بلکہ اپنی علمی فیاضیوں کی ایسی حیرت انگیز مثالیں قائم کیں جن کی نظیر سلاطین
میں نہیں ملتی۔ ان بادشاہوں کے یادگار کارنامے یقیناً تاریخ کا قیمتی
سرمایہ ہیں جو آج بھی محققین و مورخین کی دسترس ہی ہیں۔ ان تاجداروں کے
عہد حکومت کا باضابطہ مکمل سرکاری اور وہی مصدقہ ریکارڈ یعنی تمام سررشتہ
جات کی مثلیں، رفاہی اور علمی فیاضیوں کی روداد، احکام و فرامین اور
بلکہ لاکھوں تاریخی اسناد و کاغذات آج بھی آندھرا پردیش اسٹیٹ
آرکائیوز میں محفوظ ہیں۔ نامی گرامی مقامی و بیرونی علماء مشاہیر ادب، شعرا
اور اہل کمال کی قدردانی و سرپرستی ان بادشاہوں کا وطیرہ رہا ہے جو تاریخ
کا ایک بے مثال کارنامہ ہے جس کی تفصیلات بہت دلچسپ حیرت انگیز و
معلومات افزا ہیں۔ افسوس کہ انقلاب زمانہ نے ریاست حیدرآباد کی بساط
الٹ دی اور اہل زمانہ کے لیے یہ سب گئی گزری اور بھولی بسری باتیں
ہو گئیں۔ تاریخ کا یہ بیش قیمت سرمایہ لاکھوں مثلوں کے انبار میں دبا پڑا
ہے جس سے موجودہ دور کے محققین اور ریسرچ اسکالر بہت کچھ فائدہ

اُٹھا سکتے ہیں۔ اگرچہ بعض علماء کے تذکروں میں حیدرآباد کی علمی فیاضیوں اور اہلِ علم کی شاہانہ حوصلہ افزائیوں کا ذکر ملتا ہے لیکن وہ اتنا مجمل اور تشنۂ تحقیق ہے کہ اس سے حیدرآباد کی علمی سرپرستیوں کی صحیح تصویر سامنے نہیں آتی۔

یہ خوشی کی بات ہے اور قابلِ مبارکباد ہیں جناب ڈاکٹر سید داؤد اشرف صاحب ریسرچ آفیسر آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز جنھوں نے اس گنجِ مخفی سے آعلیحضرت آصف جاہ سابع کی بے مثل فیاضانہ اور شاہانہ سرپرستیوں کے آبدار موتیوں سے اپنی بیش بہا تالیف "بیرونی مشاہیر ادب اور حیدرآباد" مزین کرکے مولانا ظفر علی خان، مولانا عبدالحلیم شرر، مولانا شبلی نعمانی، مولانا سلیمان ندوی مولانا عبدالماجد دریاآبادی، مولوی مرزا ہادی رسوا جیسے نامور مورخ و ادیب اور فانی بدایونی، جوش ملیح آبادی اور حفیظ جالندھری جیسے مشہور زمانہ شعرا پر تحقیقی مضامین کی شکل میں ملک کو ایک نادر تحفہ دیا ہے اگرچہ ان مضامین کا دائرہ ان مشاہیر کی حیدرآباد سے وابستگی، سلسلۂ ملازمت یہاں قیام اور پھر وظیفہ پر علحدگی تک تفصیلی روداد اور ان کے علمی و ادبی کام کے لیے شاہانہ سرپرستی اور گراں قدر وظائف اور بعض ضمنی واقعات تک محدود ہے لیکن ان سارے واقعات کو بڑے حسن و خوبی اور وضاحت سے آرکائیوز میں محفوظ ریکارڈ سے مقابلہ و موازنہ کرتے ہوئے ان پر نقد و تبصرہ کیا ہے۔

قابل مؤلف نے صرف ریکارڈ ہی دیکھ کر مضامین نہیں لکھے ہیں بلکہ ان تمام مشاہیر شعر و ادب کی سوانح عمریوں اور تذکروں کا مطالعہ بھی کیا ہے نیز ان سے متعلق لکھے گئے تحقیقی مقالوں اور مضامین کو بغور پڑھا ہے اور پھر آرکائیوز ریکارڈ کی روشنی میں ان کو جانچا، پرکھا اور ان غلطیوں اور فرو گذاشتوں کی نشان دہی کی جو دانستہ یا نادانستہ خود ان شخصیتوں یا اُن کے مقالہ نگاروں سے سرزد ہوئی ہیں۔ اگر وہ بعض غلطی ہائے مضامین سے پردہ نہ اُٹھاتے تو غلط فہمیوں کی وجہ اصل حقائق پردۂ خفا میں رہتے۔ مضامین کے آخر میں مشاہیر کی درخواستوں، بعض ضروری ریکارڈز اور فرامین کے زیراکس (عکس)

بھی پیش کر دیئے ہیں اور تحقیق سے دلچسپی رکھنے والوں کے استفادہ کے لیے مثلہ اور ریکارڈ کے نمبر و نشان بھی بتا دیئے ہیں۔

بعض ایسی سخن گسترانہ باتوں کا انکشاف بھی قابل مولف کو کرنا پڑا جو بیان نہ ہوتیں تو حقائق سامنے نہ آتے۔ مثلاً جناب جوش ملیح آبادی نے اپنی مشہور و معروف سوانح عمری "یادوں کی برات" میں ریاستِ حیدرآباد میں اپنی آمد ملازمت اور پھر ریاستِ حیدرآباد سے اخراج کے واقعات بہت مسخ کرکے اپنے شخصی کردار کو ایک فیاض اور علم پرور بادشاہ کے مقابلہ میں نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے لیکن جناب جوش سے متعلق دو مضامین "جوش ملیح آبادی کی دارالترجمہ میں ملازمت" اور "جوش ملیح آبادی کا ریاستِ حیدرآباد سے اخراج"، میں پیش کردہ ریکارڈ اور اس معافی نامہ کو جسے جناب جوش نے حضور نظام کی خدمت میں پیش کیا تھا پڑھ کر جوش کی غلط بیانی کی قلعی کھل جاتی ہے۔ لوگ فرشتوں کے لکھے پر پکڑے جاتے ہیں لیکن جناب جوش ملیح آبادی خود اپنے لکھے پر پکڑے گئے ہیں۔

ان مشاہیر شعر و ادب کے سوانح حیات پر محققین نے تحقیقی کام کیا ہے لیکن زیر تبصرہ کتاب کے مطالعہ سے ثابت ہے کہ ان کے تحقیقی مقالوں میں حیدرآباد میں ان کے قیام کی مدت اور ریاستِ حیدرآباد کی جانب سے ان کی علمی خدمات پر جو گراں قدر وظائف ملتے تھے اس کا ذکر کسی میں نہیں۔ حالانکہ مولانا ظفر علی خان کا ریاست میں قیام بقول فاضل مولف نصف صدی سے زیادہ رہا اور مولانا عبدالحلیم شرر نے یہاں چودہ سال گزارے! اور شاہان الطاف و عنایات سے بہرہ مند بھی ہوئے یہ ناسپاسی نہیں تو اور کیا ہے کہ سیرت نگار نبوی مولانا سلیمان ندوی اور مولف حیات سلیمانی نے سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تالیف کے سلسلہ میں ریاست حیدرآباد کی بیش بہا امداد و اعانت کے بارے میں کہیں ذکر نہیں کیا۔

مولانا شبلی نعمانی سے متعلق دو مضامین بطور خاص بہت اہم اور معلومات افزا

ہیں۔ پہلی مرتبہ یہ معلومات منظر عام پر آئے ہیں جو اب تک محققین کی نگاہوں سے مخفی تھے۔ یہ انکشاف اہل حیدر آباد کے لیے باعثِ فخر و مباہات ہے کہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم تصنفی کارنامہ کی سعادت بھی دولت آصفیہ کے حصے میں آئی۔ مورخ اسلام و عالمِ دین مولانا شبلی نعمانی اور ان کے لائق شاگرد مولانا سلیمان ندوی نے سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تکمیل و تدوین چھ جلدوں میں کی۔ اس عظیم الشان تصنیف کی تکمیل کے لیے آصف سابع نے جس فراخدلی اور جوشِ ایمانی سے ان کی اعانت کی اور امداد دی ہے وہ تاریخ کا لاثانی کارنامہ ہے ان مصنفین کو ان کے علمی و تحقیقی پراجکٹ کے لیے چودہ سال تک ان کے شایان شان وظائف سے سرفراز کیا گیا اور پھر ان کی ذات کے سوا ان کے قائم کردہ دار المصنفین کو بھی ماہانہ مستقل وظیفہ جاری رہا۔ لیکن یہ بھی بڑے تعجب کی بات ہے کہ خود مولانا سلیمان ندوی صاحب سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم جلد اول اور جلد پنجم کے دیباچوں میں فرمان روائے بھوپال سلطان جہاں بیگم کی شاہانہ امداد (دو سو روپے ماہانہ) کا ذکر تو بہت عقیدت مندانہ اور شاندار الفاظ میں کیا ہے اور حضور نظام آصف سابع کی فیاضانہ امداد کا یوں ہی سرسری ذکر کیا۔ گویا ان کی نظر میں کوئی اہمیت ہی نہیں۔

ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ان مضامین کو پڑھنے کے بعد حضور نظام عالی مقام آصف سابع کی شخصیت کے چند پہلو اجاگر ہوئے ہیں۔ وہ ایک خود اختیار بادشاہ ہونے کے باوجود کوئی حکم نافذ کرنے سے پہلے ہمیشہ اپنی کونسل (مجلس وزراء) کی رائے معلوم کرنا ضروری سمجھتے تھے اور کونسل کی رائے کو بہت اہمیت دیتے تھے اگرچہ بادشاہت تھی مگر طرزِ حکومت جمہوری تھا۔ قدر دانی علم وفن کا یہ حال تھا کہ جناب فانی بدایونی کو ملازمت دینے کے لیے خود اپنے ملکی قانون کو نظر انداز کر کے استثنائی حکم دیا۔ سب سے زیادہ متاثر کن بات یہ ہے کہ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تالیف کے دوران حکومت ہند نے ریذیڈنٹ کے ذریعہ مختلف حیلوں سے دار المصنفین کی امداد جو

حکومت سرکار عالی کی جانب سے جاری تھی، مسدود کرنے کے لیے آصف سابع پر دباؤ ڈالا لیکن آپ اس کو کبھی خاطر میں نہیں لائے اور ریذیڈنٹ کو یہ اطلاع دینے کا حکم دیا کہ جس کام کی تکمیل کے لیے دار المصنفین کو رقم دی جارہی ہے وہ ایک مذہبی کام ہے اس امداد کو روکا نہیں جاسکتا! اس زمانہ میں جب کہ انگریزوں کا اقتدار عروج پر تھا برطانوی ارباب حکومت کو ایک والیِ ریاست کا بے باکانہ جواب دینا قوت ایمانی کا مظاہرہ نہیں تو اور کیا ہے۔ جناب ڈاکٹر صاحب نے اس موقع پر آصف سابع کے جوش ایمانی اور جرأت مندانہ اقدام کی ستایش کرتے ہوئے صحیح لکھا ہے کہ "آج کے دور میں کون نہیں جانتا کہ ماتحت حکومتیں کوئی ایسا اقدام کرنے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوتیں جس سے ان کی ہائی کمان کی پیشانی پر بل پڑیں" (ص ۸۳)۔ ان تمام مضامین کے پس منظر میں اور پیش کردہ ریکارڈ کے آئینہ میں وہ تمام تنقید نگار اپنے اصلی روپ میں نظر آتے ہیں جو حضور نظام کو طرح طرح سے بدنام کرنے کی متعصبانہ مذموم کوششیں کرتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہ مشتے نمونہ از خروارے ہے ورنہ آرکائیوز کے مصدقہ ریکارڈ میں حضور نظام کے آئین حکومت میں عدل و انصاف، رعایا کی خوش حالی اور بھلائی کے لیے ان گنت اسکیمات پر عمل آوری امداد و دہش اور بلا لحاظ مذہب و ملت امداد کی ایسی روشن مثالیں ملیں گی کہ آج کے جمہوری دور میں بھی ان کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

فاضل مولف نے "گزارش احوال واقعی" میں آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز میں محفوظ ریکارڈ کے ذخائر اور ان کی تاریخی اہمیت و نوعیت کا تعارف بھی مختصر مگر جامع الفاظ میں کیا ہے۔ خاص طور سے آصف جاہی دور کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا بیان بڑا اہم ہے کہ تقریباً دو سو ۲۰۰ سال کی مدت پر یہ ریکارڈ محیط ہے اور ایک اندازے کے مطابق ان کی تعداد ایک کروڑ ہے (ص ۹ کتاب ہٰذا)۔ ان کی سیر کرنے والوں اور

آرکائیوز ریکارڈز سے ناواقف حضرات کے لیے یہ ناقابل یقین بات ضرور ہے مگر مولف نے ایک ذمہ دار ریسرچ آفیسر کی حیثیت سے جو کچھ لکھا ہے وہ ایک حقیقت ہے۔

جناب ڈاکٹر سید داؤد اشرف صاحب کو علم و ادب کا شوق اپنے بزرگوں سے ورثہ میں ملا ہے جیسا کہ اپنے پیش لفظ میں محترم جناب عابد علی خاں صاحب نے بتایا ہے کہ میدانِ ادب میں وہ نو وارد اور نو آموز نہیں ہیں لکھنے کا شوق اور تحقیق سے دل چسپی انھیں شروع سے رہی ہے جب وہ ایم اے میں زیرِ تعلیم تھے تو شاعرِ انقلاب مخدوم محی الدین کے حالاتِ زندگی کئی نشستوں میں خود مخدوم سے دریافت کرکے مرتب کیے۔ ان کا یہ مقالہ ۱۹۶۸ء میں "مخدوم ایک مطالعہ" کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہوا جس کی خود مخدوم نے تعریف کی تھی۔ اس طرح مخدومؔ پر ان کا یہ مقالہ ایک مستند کتاب کا درجہ رکھتا ہے۔ ان کی دوسری کتاب "اور کچھ بیان اپنا" ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی جو ان کے تنقیدی اور نثری تقریروں کا مجموعہ ہے اور ان کی ناقدانہ صلاحیتوں اور شعر و ادب کے اعلیٰ ذوق کی عکاسی کرتی ہے۔

فاضل مولف کو اپنی اس گراں مایہ اور قابلِ قدر تالیف کے دوران جن صبر آزما کاوشوں سے دوچار ہونا پڑا ان کا اندازہ کرنے سے ہم قاصر رہتے اگر وہ خود اس کا اظہار نہ کرتے۔ آغاز کتاب میں "گذارش احوال واقعی" کے زیرِ عنوان وہ لکھتے ہیں :-

"ادب میں مستند اور مکمل تحقیق کے نمونے پیش کرنے اور ان دیکھے گوشوں پر سے پڑے پردوں کو ہٹانے کے لیے بڑی ریاضت اور عرق ریزی متقاضی ہوتی ہے اور پھر چھان بین، تصدیق اور توثیق اور تجربہ و تقابل کے لیے خاص منطق اور سائنٹفک طریقے اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ تلاش خود ایک ریاضت ہے۔" (ص ک) ان کے اس بیان کے بعد اس تالیف کی قدر و اہمیت بڑھ جاتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کس قدر

سے لکھی گئی ہے ۔
ڈاکٹر صاحب اپنے محکمہ کے ایک ذمہ دار عہدہ دار ہیں سرکاری
نجام دہی کے ساتھ ساتھ وہ طالب علموں اور ریسرچ کا کام
کی نہایت مستعدی اور خوش اخلاقی سے رہبری اور مدد
ہتے ہیں ۔ اتنی گران بار مصروفیات کے باوجود ایک ایسی اہم
کا معرض وجود میں آنا معجزے سے کم نہیں ۔
لیف جن مضامین پر مشتمل ہے وہ جب یکے بعد دیگرے حیدرآباد دکن
مقبول عام روزنامہ "سیاست" میں شائع ہوتے رہتے تو بیش تر
لی خواہش تھی کہ ان کا مجموعہ کتابی صورت میں شائع ہو تو بہتر
خود فاضل مولف نے یہ ضرورت محسوس کی اور ان مضامین کو
یقے سے ترتیب دیا اور حیدرآباد کی چہارصد سالہ تقاریب کے
ملک خاص کر اہل علم وتحقیق کو ایک گران قدر علمی تحفہ دیا ۔
حقیقی کتاب کی اشاعت جیسا کہ فاضل مولف نے لکھا ہے محدود
جہ مشکل بلکہ محال تھی مگر جناب عابد علیخان صاحب ایڈیٹر روزنامہ
اور جناب محبوب حسین جگر صاحب جائینٹ ایڈیٹر کی حوصلہ افزائی
نوازی کی وجہ سے ادارہ سیاست کی جانب سے نہایت نفاست
سے شائع ہوئی ہے ۔
سفینہ دور سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے یہ ایک خوش آیند
کہ جناب ڈاکٹر سید داؤد اشرف صاحب اپنی تحقیقی سرگرمیوں کو
کے ساتھ جاری رکھے ہوئے ہیں ۔ چنانچہ روزنامہ سیاست میں اس
آرکائیوز ریکارڈ سے مزید تاریخی یادگار مضامین شائع ہوئے
امید کرتے ہیں کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا اور آئندہ سال نو کا
کی ایک اور تالیف ہمارے ہاتھ میں ہوگی ۔

شاہان بے تاج پر ایک نظر

محترمہ وحیدہ نسیم صاحبہ برصغیر ہندو پاک کی مشہور شاعرہ اور افسانہ نگار ہیں۔ حیدرآباد دکن میں ۱۹۲۷ء میں پیدا ہوئیں لیکن تین ماہ کی عمر میں اورنگ آباد منتقل ہوئیں۔ یہیں پروان چڑھیں۔ حیدرآباد کے اسکول اور جامعہ عثمانیہ جیسی درس گاہ سے فارغ التحصیل ہوئیں۔ تقسیم ہند اور سقوط حیدرآباد کے بعد ۱۹۵۲ء پاکستان منتقل ہوگئیں۔ ابھی دو ماہ قبل ستمبر ۱۹۸۸ء میں ایک طویل مدت کے بعد اپنے وطن حیدرآباد تشریف لائیں تو آپ کے استقبال میں مشاعرے اور ادبی محفلیں ہوئیں۔ دکن کے موقر اردو اخبار "سیاست" میں یہ اعلان نظر سے گزرا کہ حضرت منتجب الدین زرزری بخش (اورنگ آباد) کے عرس ۱۹ ار اکتوبر ۱۹۸۸ء کے موقع پر آپ کی تصنیف "شاہان بے تاج" کی رسم اجراء عمل میں آئی۔ جو اورنگ آباد کے بزرگانِ دین اور اولیاء اللہ کے تذکرہ پر مشتمل ہے تو محترمہ وحیدہ نسیم جیسی بلند پایہ ادیب اور افسانہ نگار کے جادو رقم قلم سے لکھی گئی کتاب "شاہان بے تاج" پڑھنے کے شوقِ بے حد سے مجبور ہوکر فوراً ہی ہم نے ایک مہربان دوست کے ذریعہ اورنگ آباد سے کتاب منگوائی۔ کتاب پڑھنے سے پہلے رہ رہ کر دل میں خیال آتا رہا کہ ایک شاعرہ اور افسانہ نگار کو اولیائے کرام کے حالات لکھنے کی کیوں ضرورت پیش آئی اور اس کا پس منظر کیا ہے؟ دل میں تجسس آمیز خواہش کی لہر بھی یہ دیکھنے کے لیے مضطرب رہی کہ ایک افسانہ نگار کا شوخ و بے باک قلم ان تقدس مآب ہستیوں کے حالات لکھتے ہوئے حدادب کی پابندیوں اور تحقیق کی ذمہ داریوں سے کس طرح عہدہ برآ ہوا ہوگا! لیکن ہماری ساری غلط فہمی محترمہ کے پیش لفظ اور دوسری تحریر سے دور ہوگئی۔

محترمہ نے اس حقیقت کا انکشاف کیا کہ "جن صوفیا اور اولیاء کی خاک پا کے صدقے میں میری مشت خاک کندن بنی وفور عقیدت بن کر اِن کو "شاہان بے تاج" کے نام سے موسوم کرکے ان کی سوانح حیات کا آغاز کررہی ہوں"۔ [ص ۱۳] پہلے تو محترمہ نے اورنگ آباد جیسی اولیاء اللہ سے معمور مقدس سرزمین میں آنکھیں کھولیں۔ سن شعور کو پہونچیں تو گھر کا ماحول بزرگوں کی کرامت اور عقیدت مندیوں سے آباد تھا۔ سینہ بہ سینہ جو کچھ سنا بچپن ہی سے ذہن میں محفوظ رکھا۔ خاص طور سے آپ کے حقیقی خالو حافظ نصیر احمد علوی صاحب محکمہ اوقاف اورنگ آباد کے مہتمم تھے۔ نادر کتابیں اور انوکھے نسخے سب سرکاری طور سے علوی صاحب کی تحویل میں تھے۔ اپنے ان خالو صاحب کے بارے میں محترمہ لکھتی ہیں "وہ خود شریعت کے پابند تھے اور بزرگانِ دین کے خلاف کسی غلط بیانی کو برداشت ہی نہ کرسکتے تھے"۔ [ص ۱۹۱] ظاہر ہے محترمہ نے ان ہی اپنے قابل اعتماد قریبی بزرگوں سے استفادہ کیا ہے۔ محترمہ نے سُنی ہوئی باتوں پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اولیائے کرام کے سوانح حیات کی دریافت میں تاریخ کے اوراق پارینہ اکٹھا کئے، تصوف کی کتابیں اٹھائیں اور آثار قدیمہ کے گم شدہ باب تلاش کئے [ص ۱۹] جب انھیں ۱۹۸۷ء میں پنشن ہوگئی تو انھوں نے شاہان بے تاج جیسی کتاب تصنیف کی۔

راقم الحروف کے والد مرحوم بڑے عقیدت مند مرید حضرت خواجہ شمس الدین محمد چشتی رح اورنگ آبادی کے تھے۔ حضرت خواجہ صاحب رح کے عرس کے موقع پر ہر سال ہمارا پورا گھر اورنگ آباد جاتا تھا اور ہمارا قیام مہینہ دو مہینے درگاہ شریف میں رہتا۔ خواجہ صاحب کا مزار و گنبد مشہور و معروف بزرگ حضرت شاہ نور حموی رح کے گنبد کے پہلو ہی میں واقع ہے۔ اور بھی رشتہ دار حضرت خواجہ صاحب رح کے مرید تھے۔ اس لیے میں نے بچپن ہی سے اِن دو بزرگوں کے واقعات اور کرامتوں کا ذکر سنا ہے حضرت والد فرماتے تھے کہ انھوں نے میرا نام "نور الدین" حضرت شاہ نور حموی رح کے نام پر رکھا ہے۔

کتاب شاہانِ بے تاج" جب میرے ہاتھ میں آئی تو میں نے سب سے پہلے بڑے شوق اور جذبۂ بے اختیار سے جن بزرگ کے حالات پڑھے. وہ حضرت شاہ نور حمویؒ تھے. معلومات میں اضافہ ضرور ہوا لیکن محترمہ کے بعض نوشتہ واقعات قابلِ غور اور محلِ نظر ہیں.

اسے میں بزرگوں کا تصرف سمجھتا ہوں کہ ایک مخطوطہ مختصر سے چار اوراق کا جو مجھے مل گیا. دراصل یہ محترمہ کے خالو صاحب حافظ نصیر احمد علوی صاحب کے مضمون "ھوالنور" کی نقل ہے جسے موصوف نے ۱۳۵۲ف (۱۹۴۳ء) کو نشرگاہ حیدرآباد کے لیے لکھا تھا. اس مضمون کی نقل جناب میر رحمت علی صاحب شمسی رفیق نے بتاریخ ۳ ر شہریور ۱۳۵۴ف (۱۹۴۵ء) بمقام لنگر خانہ نوریہ شمسیہ نقل کر کے نقل مطابق اصل لکھ کر اپنے دستخط مثبت کئے ہیں. جناب رفیق حضرت خواجہ شمس الدین محمدؒ کے ارادت مند مُرید اور حضرت والد مرحوم کے برادرِ طریقت تھے. اکثر ہمارے گھر آیا کرتے تھے. یقین ہے کہ مضمون کی نقل موصوف نے والد کو دی تھی. برسا برس سے یہ چند اوراق پارینہ بیکار پڑے تھے. کسے معلوم تھا کہ آج وہ اتنے کارآمد ثابت ہوں گے. محترمہ وحیدہ نسیم کے بیان کی روشنی میں ان کے خالو جناب علوی صاحب کا یہ مضمون بڑی اہمیت کا حامل ہے.

ہمارے پیشِ نظر جناب عبدالجبار ملکاپوری کا اردو تذکرہ اولیائے دکن (محبوب ذی المنن مطبوعہ ۱۳۳۲ھ) بھی رہا. محترمہ نے حضرت شاہ نور حمویؒ کا حال اور دوسرے اولیا کے حالات میں اسی تذکرہ سے استفادہ کیا ہے.

حضرت شاہ نور حمویؒ کے بیان میں محترمہ نے عالمگیر کے دیوان (وزیر) کا ذکر کیا ہے. جناب علوی صاحب کے مضمون اور تذکرہ اولیائے دکن میں بھی عالمگیر کے دیوان سے بعض اہم واقعات منسوب کئے گئے ہیں. اس لیے ہم نے مناسب سمجھا کہ صمصام الدولہ شاہ نواز خاں کے فارسی تذکرہ "مآثر الامرا" کا مطالعہ کریں جس میں عہدِ مغلیہ کے تمام مشہور و معروف امرا کے

حالات درج ہیں۔ یہ تذکرہ ہماری تحقیق کا اہم ماخذ ثابت ہوا۔

ہم یہ واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہم کوئی ادیب ہیں نہ محقق۔ ایک طالب علم کی حیثیت سے محترمہ وحیدہ نسیم صاحبہ کے مضمون "حضرت شاہ لوز حمویؒ کو تذکرہ تذکروں کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ جس کے نتیجہ میں چند شبہات پیش آئے۔

"حضرت شاہ لوز حمویؒ اپنے اسی نام سے مشہور خلائق ہیں۔ محترمہ وحیدہ نسیم نے اسی نام کو زیب عنوان کیا ہے۔ تذکرہ اولیائے دکن نے حضرت کا اسم گرامی "شاہ لوز محمد حموی" کہا ہے۔ جناب حافظ نصیر احمد علوی صاحب سابق مہتمم اوقاف اورنگ آباد نے حضرت کا نام "سید لوز محمد" بتایا ہے اور صمصام الدولہ شاہ نواز خان نے اپنے تذکرہ "مآثر الامرا" میں جہاں بھی حضرت کا نام لکھا ہے "میاں شاہ لوز حمامی" لکھا ہے (ملاحظہ ہو "مآثر الامراء" مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگلہ صفحہ ۲۶۴ کتاب خانہ اسٹیٹ آرکائیوز آندھرا پردیش انڈیا)

حضرت کے جو حالات درگاہ میں لکھے ہوئے ہیں۔ ان میں نام "سید لوز محمد حموی" ہے۔ سلسلۂ بیعت کا شجرہ مجھے مل نہ سکا۔ جس سے صحیح نام معلوم ہو سکتا۔ جناب نصیر احمد علوی صاحب مہتمم اوقاف رہ چکے تھے۔ اس لیے سرکاری ریکارڈ دیکھ کر انھوں نے جو نام لکھا میری دانست میں وہی صحیح ہوگا۔

جناب علوی صاحب نے لکھا کہ علاقہ خراسان کے قصبہ "حمات" میں حضرت شاہ لوز پیدا ہوئے تھے۔ اس لیے حموی کہتے ہیں۔ آپ کے والد، سید شرف الدین بھی قطب حموی کے لقب سے ملقب ہوئے تھے۔ صاحب تذکرہ مآثر الامرا نے "حمامی" لکھا ہے۔ وہ اس کی یہ توجیہ کرتے ہیں کہ حضرت شاہ لوزؒ غربا کو جوان سے ملنے آتا حمام کے لیے "دو تلوس" دیتے تھے اس لیے "حمامی" کے لقب سے ملقب ہوئے۔ لیکن یہاں بھی علوی صاحب کی بات درست معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ پن چکی اورنگ آباد میں سید شاہ تاج الدینؒ کا مزار ہے۔ جس کے نام کے ساتھ لقب "حمویؒ" ہے۔ اور کرنول میں

سید عبداللطیف حمویؒ کی درگاہ ہے۔

جناب علوی صاحب نے اپنے مضمون میں بتایا کہ حضرت شاہ نور حمویؒ ۷۵۴ھ میں پیدا ہوئے۔ اگر ہم اس تحقیق کو درست سمجھیں تو امیر تیمور صاحبقران کے عہد میں آپ پیدا ہوئے۔ اور عالمگیر کے دور میں ۱۱۰۴ھ وفات پائی۔ اور بوقت انتقال عمر تین سو پچاس (۳۵۰) سال تھی!

محترمہ نے "امانت علی دیانت علی" کو عالمگیر کا معتبر اور معتمد وزیر بتایا ہے۔ (صفحہ ۱۸۳) اسی نام کو صفحہ ۱۸۷ - ۱۸۸ - ۱۸۹ پر صرف امانت علی لکھا اور صفحہ ۱۸۶ پر یہی نام امانت علی خاں مندرج ہوا ہے۔ مآثر الامراء میں ایسے کسی وزیر کا نام امانت علی یا امانت علی خاں موجود نہیں ہے۔ جو اورنگ آباد میں عالمگیر کے دیوان تھے۔ صاحبِ تذکرہ اولیائے دکن نے کوئی عہدہ لکھے بغیر صرف یہ بتایا کہ "دیانت خان آپ کے مرید خاص تھے (ص ۱۱۰)" جناب علوی صاحب نے بھی اتنا سنایا کہ "دیانت خاں عالمگیر کی وزارت کے فرائض انجام دیتے تھے اور حضرت کے مرید تھے"!

واقعہ یہ ہے کہ صمصام الدولہ شاہ نواز خان کے مشہور تذکرہ مآثر الامراء میں عالمگیر کے تمام مشہور امراء کا ذکر موجود ہے۔ ہم نے امانت علی کو تلاش کیا وہ تو نہیں ملے البتہ امانت خان۔ امانت خاں ثانی۔ دیانت خاں۔ دیانت خاں ثانی کا ذکر بحیثیت دیوان بڑی تعریف و توصیف اور تفصیل کے ساتھ لکھا ہوا پایا۔ ہم تفصیل میں گئے بغیر مآثر الامراء سے بقدر ضرورت مختصراً ان امراء کے بارے میں چند جملے لکھنا ضروری سمجھتے ہیں تاکہ ان امراء کے نام اور کام کے تعلق سے جو غلط فہمیاں ہوئی ہیں ان پر غور کریں۔

امانت خان — نام میرک معین الدین احمد خوافی اور خطاب امانت خاں صاحب تذکرہ مآثر الامراء نے آدھا صفحہ القاب تعریف میں لکھے ہیں۔ عالمگیر جیسے دُور اندیش اور محتاط بادشاہ کے بہت ہی قابل اعتماد امیر تھے۔ امانت و دیانت کے جوہر سے آراستہ تھے۔ عالمگیر نے امانت خاں کے خطاب

ہے کہ مزار و گنبد دیانت خان نے تعمیر کی۔ مآثر الامراء سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ آپ کا مزار، گنبد اور خانقاہ دیانت خان ثانی نے بصرفہ کثیر تعمیر کرائی۔

محترمہ لکھتی ہیں "امانت علی [صحیح نام دیانت خان] کو حضرت شاہ نور حموی رح صاحب سے اتنی عقیدت تھی کہ اس نے کسی مجاور سے خواب میں فرمایش کی کہ حضرت شاہ نور حموی رح صاحب کے مزار مبارک پر کے پھول باہر پھینکنے کے بجائے میری قبر پر ڈال دیئے جائیں چنانچہ اس پر صدیوں سے عمل ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ احاطہ پھولوں سے بھر گیا۔ اور کسی کو یاد بھی نہ رہا کہ یہاں کوئی مزار ہے اس کے بعد اس کی صفائی ہوئی۔ مزار برآمد کیا گیا لیکن حضرت شاہ نور حموی رح کے مزار کے اترے ہوئے پھول اب تک وہیں ڈالے جاتے ہیں" (صفحہ ۱۹۰)۔

صاحب تذکرہ اولیاء دکن اس روایت کے بارے میں خاموش ہیں۔ البتہ جناب علوی صاحب نے اپنی تقریر میں اس تعلق سے دوسری روایت بیان کی ہے یعنی "وصیت کی جاتی ہے کہ مزار منور کے باسی اور مرجھائے ہوئے پھول میری تربت پر ڈالے جایا کریں تاکہ تمکنت جہانبانی مرجھائے ہوئے پھولوں کی خاک میں روندی جاتی رہے" کسی مجاور سے خواب میں آکر خواہش کرنے سے زیادہ موثر اور قابل فہم وصیت کرنا ہے جس سے ارادت و عقیدت کا اظہار ہوتا ہے۔ ہم نے بزرگوں سے سنا بھی یہی ہے۔

محترمہ نے اپنے مضمون میں (صفحہ ۱۸۶ تا ۱۸۹) حضرت شاہ نور حموی رح کی کرامت کا تذکرہ بڑے دلچسپ ڈرامائی انداز سے کیا ہے۔ بیان طویل ہے مختصر بس اتنا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر نے اپنے معتبر و معتمد اور مخلص وزیر امانت علی بن دیانت علی [محترمہ نے یہی نام لکھا ہے] کو طلب کیا اور حکم دیا کہ وہ تیز رفتار گھوڑے پر دلی جائے اور شاہی محل میں ایک مخصوص جگہ پر رکھے ہوئے شاہی دستاویزات لے کر اسے

قیام کئے بغیر فوراً اورنگ آباد لوٹ آئے۔ امانت علی نے حکم کی تعمیل کی اور دستاویزات لے آئے۔ لیکن ایک اہم دستاویز لانا بھول گئے۔ اورنگ زیب نے امانت علی پر شبہ کیا اور غصہ اور خفگی کا اظہار کرتے ہوئے تین دن کے اندر دلی جاکر دستاویزات لانے کا حکم دیا ورنہ سر قلم کرنے کی دھمکی دی۔ امانت علی سے ناممکن تھا کہ تین روز کے اندر دلی جائے اور دستاویزات لائے۔ وہ بے حد پریشان رہا جب تین دن ختم ہونے کو ایک گھنٹہ رہ گیا تو وہ شاہ نور حمویؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر قدم بوس ہو کر اپنی مجبوری و پریشانی رو رو کر سنائی۔ حضرت نے تسلی دی اور ایک کپڑا امانت علی پر ڈال کر فرمایا کہ تم اپنی دستاویز اٹھالو۔ کپڑا ڈالنے سے امانت علی کی آنکھوں کے سامنے دلی کا محل کھڑا تھا جہاں جاکر امانت علی نے مطلوبہ دستاویز لے لی اور جب کپڑا ہٹا تو امانت علی کے ہاتھ میں دستاویز تھی!

نہیں معلوم محترمہ نے متذکرہ روایت کس سے سنی اور کہاں پڑھی۔ البتہ اس کرامت سے ملتی جلتی کرامت کا ذکر تذکرۂ اولیاء دکن میں موجود ہے کہ "ایک روز شاہ صاحب نے پوچھا دیانت خان اکبر آباد کے قلعہ سے بھی کچھ خبر رکھتے ہیں؟ وفور اعتقاد سے عرض کی کہ میں درگاہ خلائق سے خبر رکھتا ہوں۔ باقی تمام سے فراموش ہوں۔ فرمایا جانب قلعہ دیکھئے۔ دیانت خاں نے حسب الحکم دیکھا کہ قلعہ آگرہ نمایاں ہے اور خاص ان کی حویلی جو وہاں بھی موجود ہے۔ حویلی میں اپنی والدہ کے مقبرے کو بھی دیکھا۔ شاہ صاحب نے فرمایا دیکھا۔ عرض کی دیکھا۔ بعد ازاں تمام نظر سے غائب ہو گیا۔ (صفحہ ۱۱۰۶) جناب علوی صاحب نے بھی تذکرۂ اولیاء دکن کی اس روایت کی ہمنوائی کی ہے۔ میں نے بھی اپنے بزرگوں سے اس تعلق سے ایک اور ہی روایت سنی ہے۔ بچپن میں سنی ہوئی یہ روایت اس ضعیف العمری میں بھی اچھی طرح یاد ہے۔ مگر اب اس کے بیان کرنے سے کیا حاصل۔ ہم بزرگان دین اور اولیاء اللہ کی کرامتوں کے بجان و دل قائل ہیں لیکن

ہمیں پیروں کی کرامت کا سودا نہیں ہے۔ ہم اپنے تجربہ کی بناء پر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ "حقیقت روایات میں کھو گئی"

محترمہ نے اپنی بیان کردہ کرامت کے واقعہ کے سلسلہ میں انکشاف کیا کہ اورنگ زیب عالمگیر صوفی سرمد کے قتل کے سبب بے حد پریشان ہوئے اور ان کے دل کا سکون ختم ہو گیا تھا۔ جب امانت علی کی زبانی شاہ لوز حموی کی کرامت سنی تو وہ فوراً شاہ لوز حموی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سکون دل کی دُعا کے طالب ہوئے۔ محترمہ لکھتی ہیں "سرمد شہید کا خیال تمہیں کہیں چین نہیں لینے دیتا" آپ کی یہ نرم اور دھیمی آواز شہنشاہ ہند کا دل چیر گئی۔ فوراً اس مرد خدا کے قدم پکڑ لیے۔ اس کے بعد شاہ لوز حموی صاحب نے اس کو اپنے پیروں کی خاک چٹا کر یہ کہا کہ اب تمہیں اس بستی میں قرار آجائے گا" صفحہ (۱۸۹) اورنگ زیب کو حضرت شاہ لوز حمویؒ کے پاؤں تلے کی خاک چٹانے کے بعد مزید محترمہ فرماتی ہیں "اس کی موت کے بعد حضرت کی دُعا کے مطابق یہ تاثیر اس کی قبر کی مٹی میں باقی رہی کہ جو بے قرار اس کو کھائے قرار آجائے۔۔۔۔ وہاں کی مٹی کو لوگ اختلاج قلب اور ہول دل کے لیے اکسیر سمجھ کر اب بھی اٹھاتے ہیں" (صفحہ ۱۹۰) واقعی محترمہ نے کرامت بعد وفات کا زندہ ثبوت فراہم کیا ہے۔ از کرامات شیخ ما چہ عجب!

جناب علوی صاحب نے جو روایت اپنے مضمون میں لکھی وہ محترمہ کے بیان کردہ روایت وکرامت کے بالکل برخلاف ہے۔ ان کی تحقیق میں یہ بات آئی ہے کہ "انصاف شعار بادشاہ کا نفس معدلت پسند ہر وقت اندر ہی اندر کچوکے دیتا رہتا ہے کہ تعمیر اساس سلطنت، بھائیوں کے قتل اور بوڑھے باپ کی نظر بندی سے ہوئی ہے۔ بھائیوں نے تو معرکہ کا بازار گرم کیا لیکن شفیق اور بیمار باپ بیٹے کی سرگرمیوں کو چپ چاپ دیکھتا اور سنتا رہا اور اسی خاموش زندگی میں دنیا سے چل بسا۔ جوشیلے بیٹے کو معذرت خواہی کا موقع ہی نہیں ملا۔ پرسشِ حشر کا خوف دامن گیر ہو کر سکون قلب جاتا رہا۔

اطمینان خاطر پراگندہ ہوا اور جوش ملک گیری ندامت کے تخیل سے ٹھنڈا پڑ گیا۔ مملکت مغلیہ کا تاجدار ذی اقتدار ملامت نفس سے پریشان ہو جاتا ہے بڈھے باپ کی بیمار تصویر آنکھوں کے سامنے پھرتی رہتی ہے۔ وزیر با تدبیر شاہ ذی جاہ کے انتشار خیالی سے تدبیر آمیزش کی بھیک مانگتا پھرتا ہے۔ اور دربار لوری میں حضوری کا مشورہ دیتا ہے دیگر امرائے سلطنت بھی تائید کرتے ہیں۔ بادشاہ سلامت نے قبول فرمایا۔ حاضری کی سعادت حاصل کی۔ ارشادِ عالی ہوا کہ کل صبح رات بھر ختم کلام مجید کر کے آؤ۔ بادشاہ نے تعمیل حکم کی۔ شہنشاہ ہند گدائے بے نوا کی کٹیا میں قبل نمازِ فجر آیا۔ فرمایا۔ حجرہ میں جا کو دیکھا کہ شاہ جہاں مشغول تلاوت قرآن ہے۔ عالمگیر، شاہ جہاں کے قدموں پر گر پڑا۔ رو رو کر عفو تقصیرات چاہی۔ باپ نے بیٹے کی خطا معاف کی اور لونر محمد سے توسل چاہ کر درازی عمر و خوش بختی کی دعائیں بھی دیں۔ عالمگیر چشم نمناک لیے حجرے سے نکلتا ہے۔ ملامت نفس کی سرگرمیاں اشک ندامت سے ٹھنڈی پڑ گئیں۔ قلب مطمئنہ کی تاراج دنیا پھر آباد ہو گئی۔ اس کے بعد دنیا جانتی ہے کہ عالمگیر نے کس طنطنہ و شان سے حکومت کی ہے اور لونر محمد کے صدقے میں باپ کی دعا بیٹے کے حق میں کتنی مقبول ہوئی ہے۔"

ایک طرف محترمہ وحیدہ نسیم جیسی ادیبہ ہیں جنھوں نے اولیائے کرام کی سوانح حیات لکھنے کے لیے تاریخ، صوفیہ کرام کی حیات طیبہ کی تلاش اور آثار قدیمہ کے گم شدہ باب کو پڑھا جانچا اور تحقیق کی کسوٹی پر پرکھا اور پھر حاصل تحقیق اتنا لکھا۔ دوسری طرف محترمہ کے خالو صاحب جناب نصیر احمد علوی ہیں جن کی تحقیق پر محترمہ کو اتنا اعتماد ہے کہ وہ خود کہتی ہیں کہ بزرگانِ دین کے خلاف غلط بیانی کو وہ برداشت ہی نہ کر سکتے تھے۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ محترمہ اور جناب علوی کے بیانات میں کتنا تضاد اور تحقیق میں بعد المشرقین ہے۔ کیا محترمہ اپنے خالو صاحب کے بیان کو درست سمجھتی ہیں اور کیا جناب علوی صاحب زندہ رہتے تو محترمہ کی تحقیق کو برداشت کر سکتے تھے؟ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم کس کی

بات پر ایمان لائیں۔ لیکن بجز اس کے کیا کہہ سکتے ہیں کہ خداوندا یہ تیرے سادہ لوح بندے کدھر جائیں!

تذکرۂ اولیاءِ دکن سے معلوم ہوتا ہے کہ "سید شہاب الدین خلیفہ و سجادہ حضرت شاہ نور صاحب کے تھے۔ بائیسویں تاریخ شعبان ۱۱۱۹ھ انتقال ہوا۔ مقبرہ اندرون روضہ حضرت شاہ نور قدس سرہ مسجد کے جنوبی جانب میں ہے۔ زیارت گاہ خاص و عام ہے۔ ہر سال عرس ہوتا ہے (ص۱۱)
لیکن جناب علوی صاحب کا یہ بیان بہت اہم ہے کہ "سید شہاب الدین، حافظ قطب الدین اور مولوی غلام نور کی قبریں اندرون احاطہ درگاہ بجانب جنوب مسجد ایک قطعہ اراضی پر کسمپرسی و گمنامی کی حالت میں تھیں۔ گذشتہ سال حصول جائزہ کے بعد جب مجھے اس کا علم ہوا تو بڑا دکھ ہوا۔ سابقین اولین کے مزارات کی یہ حالت لائق صد عبرت تھی۔ اسی وقت نواب شہاب الدین خان اول تعلقدار سے میں نے معروضہ کیا اور درستی کا حکم لیا۔ اب تعویذات قبور بن گئے ہیں۔ سائبان ہیں اور معتقدین فاتحہ پڑھ کر برکتیں حاصل کر سکتے ہیں"۔

اب مخترمہ کی تحقیق کا حاصل ملاحظہ ہو۔ فرماتی ہیں "خواجہ شہاب الدین عرصہ تک حیات رہے لیکن ان کا مزار کہاں ہے اس کی تحقیق یوں مشکل ہے کہ اگر اولیائے دکن کے مصنف کا لکھا درست نہ مانا جائے تو وہ مزار خواجہ شمس الدین کا ہے جن کا وصال ۱۱۹۱ھ میں ہوا اور اورنگ آباد کے پرانے لوگ ان کے دفن میں شریک تھے اور خواجہ شہاب الدین کا مزار کہیں اور تلاش کرنا پڑے گا اور اگر مصنف اولیائے دکن کا لکھا درست ہے تو یہ بھی ممکن ہے کہ یہی شہاب الدین ہوں جن کی میت کو بعد کو کہیں سے لاکر دفن کیا گیا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب (ص۹۴)

محبوب ربانی حضرت خواجہ شمس الدین محمد چشتیؒ اورنگ آباد دکن کے اولیائے کبار میں تھے۔ حضرت شاہ نور حمویؒ کے وہ جانشین تھے نہ خلیفہ۔ حضرت کے شجرۂ بیعت میں شاہ نور حمویؒ کا اسم گرامی نہیں ہے۔ البتہ وہ حضرت شاہ نور حمویؒ سے بڑی عقیدت و ارادت رکھتے تھے

اور درگاہ شاہ نور حمویؒ کے سرکار
کی جانب سے منتظم تھے۔ حضرت خواجہ صاحب کا انتقال ۱۳۳۹ھ (۱۳۲۰ف ۱۹۲۰ء) اجمیر میں سجادہ صاحب اجمیر شریف کے مکان میں ہوا۔ یہ سچ ہے کہ میت اجمیر سے اورنگ آباد لائی گئی اور درگاہ شاہ نور حمویؒ میں تدفین ہوئی۔ مریدوں اور عقیدت مندوں نے گنبد تعمیر کیا۔ حضرت کا قیام اورنگ آباد میں محلہ عثمان پورہ میں رہتا تھا۔ جہاں آپ کا مکان تھا۔ انتقال سے آج تک ہر سال ماہ جمادی الاخریٰ میں بڑے تزک و اہتمام سے عرس ہوتا ہے جب جناب عبدالجبار ملکاپوری نے تذکرہ اولیائے دکن ۱۳۳۲ھ میں مرتب و شائع کیا تو حضرت خواجہ صاحبؒ کو دنیا سے رخصت ہوئے صرف سات سال ہوئے تھے۔ اگر انھوں نے حضرت خواجہ شمس الدین محمد چشتی اورنگ آبادی کے مزار و گنبد کو سید شہاب الدین کا سمجھا تو یہ ان کی ایسی تحقیقی غلطی ہے کہ تاریخ کبھی معاف نہیں کرسکتی۔ اور اگر محترمہ نے بھی تحقیقی ذمہ داریوں سے چشم پوشی کر کے صرف اڑسٹھ ۶۸ سال پہلے کے ایک مشہور ولی بزرگ کے حالات تو کجا مزار تک سے ناواقف و لاعلم ہیں تو معلوم نہیں پانچ سو سال پہلے گزرے ہوئے بزرگانِ دین اور اولیائے کرام کے حالات اور کشف و کرامات لکھنے میں کس حد تک تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔

بہت دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ محترمہ نے معمولی تحقیق میں بھی کچھ دلچسپی سے کام نہیں لیا اور حضرت خواجہ شمس الدین محمد چشتیؒ کے خلیفہ سید حمایت حسین شاہ صاحبؒ عرف ننھے میاں شاہ جہاں پوری کے مزار و گنبد کے بارے میں لکھتی ہیں۔ "میں نے جب استفسار کیا تو پتہ چلا کہ یہ حضرت شاہ نور حمویؒ صاحب کے مجاور کا مزار ہے جن کا انتقال حال ہی میں ہوا ہے۔ (صفحہ ۱۸۴)

اگر محترمہ صحیح طور سے استفسار کرتیں تو یہ معلوم کرنے میں غلطی نہ ہوتی کہ حضرت سید حمایت حسین شاہ صاحبؒ کا انتقال سنہ ۱۹۶۵ء

(انیس سو پینسٹھ) حیدرآباد دکن میں ہوا۔ اور ان کی تدفین اورنگ آباد میں اس جگہ ہوئی جہاں آج ان کا مزار و گنبد ہے۔ جسے محترمہ مجاور کا مزار بتاری ہیں۔

ہم اپنا یہ مضمون محترم خواجہ حمید الدین شاہد صاحب مدیر ماہ نامہ سب رس کراچی پاکستان کی خدمت میں بھیج رہے ہیں۔ اس التماس کے ساتھ کہ سب رس میں جگہ دیں اور اسی کے ساتھ ہم محترمہ وحیدہ نسیم صاحبہ کے خالو صاحب جناب نصیر احمد علوی کے مضمون کا فوٹو کاپی محترمہ کے ملاحظہ کے لیے بہ توسط جناب شاہد صاحب پیش کرتے ہیں تا کہ محترمہ کچھ لکھیں تو ہم اپنے شبہات دور کرلیں۔

ایک مشہور نامور پہلوان

رستم زماں غلام محمد گاما

گاما پہلوان کے آباواجداد

گاما پہلوان کے آبا دا جداد کا وطن کشمیر تھا۔ کشمیر کے راجہ گلاب سنگھ کے عہدِ حکومت میں گاما پہلوان کے دادا ترکِ وطن کر کے امرتسر (پنجاب) منتقل ہو گئے۔ ذریعہ معاش غالیچوں کی تجارت تھا لیکن وہ خاندانی پہلوان بھی تھے اس خاندان کے دو پہلوان سلطان پہلوان اور صادق پہلوان ہندوستان کے نامی گرامی پہلوان ہوئے ہیں۔

گاما پہلوان کے والد عزیز بخش پہلوان کا جنم اسی مردم خیز سرزمینِ پنجاب میں ہوا۔ کُشتی کا فن وراثتہً چلا آرہا تھا اس لیے عزیز بخش کو بچپن سے پہلوانی کا شوق رہا اور آخر کار وہ اپنی دل چسپی اور محنت سے سترہ سال کی عمر میں ایک بڑے پہلوان بن گئے۔ اور کئی کشتیاں جیت کر شہرت حاصل کی۔

اس زمانہ میں بندھل کھنڈ کی ایک چھوٹی ریاست "دیتا" کے راجہ بھوانی سنگھ کو کُشتی کا بہت شوق تھا اور وہ پہلوانوں کے قدر دان اور مربی تھے عزیز بخش کُشتی لڑنے کے ارادہ اور قدر دانی کی اُمید لے کر ریاست "دیتا" گئے مہاراجہ بھوانی سنگھ کشتیوں کے مقابلوں میں عزیز پہلوان کی کامیابیاں دیکھ کر بہت متاثر ہوئے اور ازراہ قدردانی ان کو اپنی ریاست میں قیام کرنے پر مجبور کیا۔ ان کا وظیفہ مقرر کیا اور تمام اخراجات کی ذمہ داری لی۔ راجہ بھوانی سنگھ جیسے قدر دان راجہ کی خواہش پر عزیز بخش پہلوان ریاست "دیتا" میں رہ گئے اور پھر وہیں اس ریاست کے شاہی پہلوان "نون پہلوان" کی لڑکی سے ان کی شادی ہوگئی۔

گاما پہلوان کی پیدائش اور ان کا بچپن

گاما سنہ ۱۸۷۸ء میں ریاست "دیتا" میں پیدا ہوئے ان کا نام غلام محمد رکھا گیا بعض روایت سے غلام حسین پیار سے ماں باپ گاما پکارتے تھے۔ عجب اتفاق ہے کہ لاڈ و پیار کے نام گاما ہی سے شہرت دوام ملی اور اصل نام سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ عزیز بخش اپنے بچہ گاما کو ایک بڑا پہلوان بنانے کی آرزو رکھتے تھے اسی لیے پانچ سال کی عمر ہی میں ان کو کندھے پر بٹھا کر اکھاڑے لے جاتے تاکہ بچہ کے دل میں کشتی کا شوق پیدا ہو۔ گاما کی عمر چھ سال کی تھی کہ ان کے والد کا انتقال ہوگیا ان کے نانا نون پہلوان" نے ان کو اپنی پرورش میں لیا لیکن چند ماہ گزرے تھے کہ "نون پہلوان" کسی نزاع میں قتل ہوگیا۔ ان کے ماموں "عیدا پہلوان" نے ان کی سرپرستی کی۔ انھوں نے گاما کو فن کشتی کی تعلیم دی اور گاما کے دل میں یہ بات بٹھادی کہ ان کے والد عزیز بخش پہلوان اُن کو ایک بڑا پہلوان دیکھنے کے آرزومند تھے اس لیے ان کو ایک بڑا پہلوان بن کر اپنے والد کی آرزو کو پورا کر دکھانا ہے۔ گاما نے بچپن ہی سے اپنے والد کی خواہش پورا کرنے کا عزم کرلیا۔ کھیل کود سے کوئی دلچسپی نہ رکھی۔ صرف پہلوانی اور

ورزش ان کا کھیل تھا۔

ریاست "دتیا" کے راجہ کی سرپرستی

گاما پہلوان کے والد کے انتقال کے تین چار ماہ بعد ان کے بھائی امام بخش ۱۸۸۳ء میں ریاست دتیا ہی میں پیدا ہوئے۔ ان کے ماموں عیدا پہلوان اور چچا کلی پہلوان نے ان دونوں بچوں کو اپنی سرپرستی میں لیا لیکن راجہ بھوانی سنگھ نے اپنی ریاست کے مایہ ناز پہلوان کی دو نشانیوں کو پروان چڑھانے میں بڑی دل چسپی اور خاطر خواہ حصہ لیا گاما اور امام بخش کے فنِ پہلوانی کی تکمیل میں جس فیاضانہ حسنِ سلوک کا مظاہرہ کیا وہ تاریخ کا یادگار باب ہے۔

پہلوانوں کی قدردانی

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں کشتی اور پہلوانی کا فن نقطۂ عروج پر تھا دیسی ریاستوں میں جا بجا اکھاڑے قایم تھے۔ والیانِ ریاست نے اس فن کی ترقی کے لیے ناقابلِ فراموش کارنامے انجام دیتے ہیں۔ انھوں نے پہلوانوں کی ایسی سرپرستی کی کہ پہلوان کا کام صرف ورزش کرنا اور اپنے فن میں مہارت پیدا کرنا تھا لیکن ورزش کے موافق مقوی اور بیش بہا غذا کا استعمال اور پہلوانوں کے دیگر اخراجات اور ضروریات کی تکمیل ریاست کے خزانہ سے ہوتی تھی۔ کسرت اور کشتی کے مقابلے رکھے جاتے اور مقابلہ جیتنے والے پہلوان کو بھاری انعامات سے نوازا جاتا تاکہ ان کی ہمت افزائی ہو اور شوق بڑھے۔

ورزش کا مقابلہ

ریاست جودھ پور کے راجہ جسونت سنگھ فنِ کشتی سے دل چسپی رکھتے تھے اور پہلوانوں کے قدردان تھے۔ ایک دفعہ انھوں نے پہلوانوں کی ورزش کے مقابلہ کا اعلان کیا کہ جو پہلوان سب سے زیادہ بیٹھکیں لگائے اسے انعامِ اول دیا جائے گا۔ اس کسرتی مقابلہ میں چار سو ۴۰۰ پہلوانوں نے حصّہ لیا۔

گاما بھی اپنے ماموں بوٹا پہلوان کے ہمراہ جودھ پور پہونچے اس وقت ان کی عمر صرف نو سال تھی لیکن وہ اس کسرتی مقابلہ میں حصہ لینے مچل گئے۔ اتنی چھوٹی عمر میں بڑے پہلوانوں کے مقابل آنا بے جوڑ سی بات تھی لیکن بوٹا پہلوان کی سفارش پر مہاراجہ نے کمسن گاما کو مقابلہ میں حصہ لینے کی اجازت دے دی حیرت کی انتہا نہ رہی جب ۹ سال کے گاما نے سب سے زیادہ بیٹھکیں لگا کر انعام اول حاصل کیا!

جودھ پور میں قیام اور فن کی تعلیم

جودھ پور کے راجہ نے نو عمر گاما کی صلاحیت کو بھانپ لیا۔ انہوں نے بوٹا پہلوان کو شاہی پہلوان بنانے کا پیش کش کیا اور اس کے ساتھ گاما کو روک لیا اور فن کشتی کی تعلیم کے علاوہ ہر قسم کی سہولت اور ہر طرح کی مدد کرنے کی ذمہ داری قبول کی۔ راجہ جسونت سنگھ کی خواہش کے احترام میں بوٹا پہلوان اور گاما جودھ پور میں ٹھہر گئے۔ یہاں گاما نے بوٹا پہلوان اور مادھو سنگھ پہلوان کی نگرانی اور شاگردی میں مسلسل چار سال تک فنِ پہلوانی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔

ریاست دتیا کو واپسی

جب مہاراجہ جسونت سنگھ کا انتقال ہو گیا تو گاما اپنے وطن دتیا واپس ہوئے یہاں کے راجہ ان کے منتظر تھے انھوں نے گاما کو اپنی سرپرستی میں رکھا۔ اس وقت گاما کی عمر تیرہ سال تھی۔ اپنے درباری پہلوان عزیز بخش پہلوان کے انتقال کے بعد ان کے دونوں لڑکوں گاما اور امام بخش سے محبت اور ہمدردی ان کے دل میں تھی اور یہ محسوس کر رہے تھے کہ یہ دونوں ان کی ریاست کا نام روشن کریں گے۔ چنانچہ راجہ نے ان کے رہنے اور کھانے اور ہر ضرورت کی تکمیل کی ذمہ داری لے لی۔ کئی اچھے پہلوان ریاست میں تھے جن کے راجہ سرپرست تھے۔ گاما مزید دو سال یہاں رہ کر فنِ پہلوانی کے داؤ پیچ پر عبور حاصل کیا اور اپنی ذاتی دلچسپی اور محنت سے اِس فن میں

کامل دست گاہ حاصل کی۔

ہندوستان کے پہلوانوں سے مقابلہ کا ارادہ

گاما کو جب اپنے فن پر پختگی اور مہارت کا یقین ہو گیا تو ان کے دل میں ہندوستان کے پہلوانوں سے مقابلہ اور زور آزمائی کرنے کی امنگ پیدا ہوئی اور اُنھوں نے اپنے ارادے کی تکمیل کے لیے پورے ہندوستان کا دورہ کرنے کا ارادہ کرلیا۔ آخر وہ ریاست دیتا کے پہلوان تھے اس لیے سب سے پہلے راجہ سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا اور ان کی اجازت کے طالب ہوئے راجہ کو جب گاما کے اس عظیم ارادہ کا علم ہوا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے نہ صرف اجازت دے دی بلکہ ان کے سفر کے اخراجات اور روزمرہ خوراک کی باجائی کے کفیل بن گئے۔ واقعی یہ تھی راجاؤں کی قدر دانی اور حوصلہ مندی۔

ریاست دیوان میں قیام

پندرہ سال کی عمر میں گاما ہندوستان بھر کا دورہ کرنے اور پہلوانوں سے مقابلہ کا ارادہ کر کے ریاست دیتا سے روانہ ہوئے۔ سب سے پہلے وہ بھوپال کے قریب "دیوان" آئے۔ اس وقت راجہ پرتاب سنگھ اس ریاست کے حکمران تھے۔ اگرچہ یہ ایک چھوٹی سی ریاست تھی لیکن راجہ پرتاب سنگھ کی فن کشتی سے دل چسپی اور پہلوانوں کی قدر دانی کی وجہ یہ ریاست بڑی شہرت رکھتی تھی۔ راجہ پرتاب سنگھ بڑے نیک سیرت ابا اخلاق اور حوصلہ مند راجہ تھے راجہ کے حسن سلوک اور قدر دانی کی وجہ گاما ریاست دیوان میں چار سال تک رہنے پر مجبور ہوئے۔ گاما ہمیشہ اس ت کا اقرار اور ذکر بڑے متاثر کن انداز سے کرتے تھے کہ ان کی سیرت تعمیر میں دیوان کے راجہ پرتاب سنگھ کا بڑا حصہ ہے اس لیے وہ ب بھی راجہ کا نام لیتے تو عزت و احترام سے لیتے تھے۔ جب راجہ تاب سنگھ کا انتقال ہوگیا تو گاما ایک بار پھر اپنے وطن دیتا واپس ہوئے۔

نامور پہلوان رحیم بخش گوجرانوالہ سے پہلی کشتی

اس زمانے میں ریاست "جوناگڑھ" میں ایک بڑے دنگل کا اعلان ہوا ہندوستان کے کئی بڑے پہلوان اس دنگل میں حصہ لینے جوناگڑھ پہنچے۔ گاما نے بھی اس دنگل میں حصہ لینے کے ارادہ سے دتیا کے راجہ بھوانی سنگھ کو آگاہ کیا اور ان کی اجازت چاہی۔ گاما نے راجہ کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے اطمینان دلایا کہ وہ ریاست دتیا کے پہلوان کی حیثیت سے ہی جوناگڑھ کے دنگل میں حصہ لینگے راجہ نے خوش ہو کر نہ صرف جانے کی منظوری دے دی بلکہ ان کے اخراجات سفر اور دیگر ضروریات کی پوری ذمہ داری لے لی۔

پندرہ دن تک یہ دنگل جاری رہا ہندوستان کے شہرت یافتہ غلام پہلوان کے شاگرد رحیم بخش سلطانی والا پہلوان (گوجرانوالہ) نے جب یکے بعد دیگرے پہلوانوں کو شکست دے کر سرِ فہرست آگئے تو گاما بھرے دنگل میں رحیم بخش پہلوان کو مقابلہ کا چیلنج دیا جسے رحیم بخش پہلوان نے قبول کیا۔ ایک ہفتہ بعد کشتی مقرر ہوئی۔ رحیم بخش پہلوان اونچے پورے دیو ہیکل ہونے کے ساتھ طاقتور، تجربہ کار فن کشتی کے داؤ پیچ سے واقف مشہور پہلوان تھے۔ اس وقت وہ ریاست جوناگڑھ کے پہلوان تھے اس لیے نواب صاحب جوناگڑھ یہ مقابلہ دیکھنے دنگل تشریف لائے۔

دونوں پہلوانوں کا مقابلہ مسلسل ایک گھنٹہ ہوتا رہا۔ دونوں نے داؤ پیچ میں اپنی اپنی مہارت کا مظاہرہ کیا۔ لیکن ہار جیت کا فیصلہ نہ ہو سکا کشتی ملتوی کر دی گئی اور دونوں پہلوانوں کی برابری کا اعلان کر دیا گیا۔

تمام دنیا کے پہلوانوں کو گاما کا حیرت انگیز چیلنج

اپنی اس عظیم کامیابی کے بعد بیس سال گاما نے یقین محکم کے ساتھ تمام دنیا کے پہلوانوں کو مقابلہ کا چیلنج دے کر حیرت زدہ کر دیا۔ اس وقت ہندوستان میں خود ایک سے بڑھ کر ایک

فنِ کشتی میں مہارت رکھنے والے شہ زور، دیو ہیکل اور تجربہ کار پہلوان موجود تھے۔ پنجاب، لکھنؤ، گوالیار، بھوپال، ٹیکم گڑھ، دیتا، رتلام بڑودہ اور بنارس کے تمام پہلوان اس چیلنج کا جواب دینے اور مقابلہ کرنے اٹھ کھڑے ہوئے۔ گاما ان پہلوانوں کا مختلف مقامات پر مقابلہ کیا اور ہر مقابلہ میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی۔ جن مشہور اور بڑے پہلوانوں نے گاما سے مقابلہ کیا وہ تھے رستمِ ہند غلام محی الدین پہلوان، بدری برہمن پہلوان بدو پہلوان آگرہ، گاموپانی والا پہلوان (گونگا پہلوان کے والد) اور حسین ملتانیہ پہلوان۔ ان تمام پہلوانوں کی بڑی شہرت تھی۔ چھوٹے پہلوانوں کا کیا شمار یہ سب رُستمِ ہند خطاب رکھنے والے پہلوان گاما کے مقابل تین منٹ سے زیادہ نہ ٹھہر سکے۔

رحیم بخش پہلوان سے دوسری کُشتی

اندور کے راجہ شیوجی راؤ ہلکر پہلوانوں کے سرپرست اور بڑے قدردان تھے ان کی خواہش پر گاما اور رحیم بخش کا اندور میں مقابلہ ہوا۔ راجہ نے بطور خاص انتظامات کئے تھے اور کُشتی جیتنے والے پہلوان کو تیس ہزار روپیہ کا انعام اعلان کیا۔ گاما اور رحیم بخش کا عظیم الشان مقابلہ مسلسل دو گھنٹے تک ہوتا رہا۔ دونوں پہلوانوں نے داؤ پیچ کی ایک دوسرے پر آزمائش کی اور داؤ پیچ کے توڑ ایسا بے نظیر مظاہرہ کیا کہ جن کی یاد مدتوں دیکھنے والے نہ بھلا سکے۔ آخر ہار جیت کا فیصلہ ہوئے بغیر دونوں پہلوانوں کی برابری کا اعلان کردیا گیا راجہ نے خوش اور متاثر ہو کر گاما پہلوان کو ان تین کشتیوں کا معاوضہ جو انہوں نے اندور میں لڑی تھیں ایک لاکھ روپیہ نقد انعام دیا جو یقیناً اس زمانے میں سب سے زیادہ بڑا شاندار انعام تھا۔

دُنیا کے پہلوانوں کو گاما کا چیلنج اور سات ہزار کا پیش کش

بے شمار پہلوانوں سے گاما نے مقابلہ کیا کسی نے بھی ان کو شکست نہیں دی۔ گاما کو اپنے فن پر اور مہارت پر اِتنا

اعتماد ہو گیا کہ کلکتہ پہنچ کر دنیا کے پہلوانوں کو ایک بار پھر عجیب نوعیت کا چیلنج دیا کہ جو پہلوان بھی ان کو شکست دے گا وہ اس کو سات ہزار روپیہ نقد ادا کریں گے۔

پہلا چیلنج مقابلہ
تین سال کی خاموشی کے بعد جس پہلوان نے چیلنج قبول کیا وہ مشہور پہلوان حسین بخش ملتانیہ پہلوان تھا جب کلکتہ میں ان دونوں پہلوانوں کا مقابلہ ہوا تو صرف دو منٹ میں حسین بخش ملتانیہ پہلوان چت ہو گئے۔ اس وقت کے انگریز گورنر جو یہ عظیم الشان دنگل دیکھ رہے تھے خوش ہو کر گاما کو ایک قیمتی گرز انعام دیا۔

حسین بخش ملتانیہ پہلوان نے اپنی شکست کا بدلہ لینے گاما کا لکھنؤ اور پھر لاہور میں مقابلہ کیا لیکن ہر بار ایک دو منٹ سے زیادہ گاما کے مقابل نہ ٹھہر سکے اور انھیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

رحیم بخش پہلوان سے تیسری مرتبہ کشتی
گاما پہلوان کے چیلنج سات ہزار کے جواب میں پانچ سال بعد لاہور میں رحیم بخش پہلوان نے گاما سے تیسری بار کشتی لڑی۔ یہ ناقابلِ فراموش کشتی دو گھنٹے بیس منٹ تک زور آزمائی اور فن کے مظاہرہ پر برابری پر ختم ہوئی کیوں کہ شام کا دھندلکا چھا چکا تھا۔

لندن کی نمائش میں پہلوانوں کا دنگل
سنہ ۱۹۱۰ء میں ایک عظیم الشان صنعتی نمائش کا لندن میں انعقاد عمل میں آیا۔ منتظمین نمائش نے یہ طے کیا کہ اس نمائش میں پہلوانوں کا ایک دنگل ہو اور رستم زماں [WORLD CHAMPION] کا خطاب اعزاز اور تمغہ بطور سند اسی پہلوان کو دیا جائے جو نمائش کے دنگل میں فائنل مقابلہ جیتے۔ اس عظیم الشان بین الاقوامی مقابلہ کا نام "جان بل چمپئن شپ" قرار دیا گیا۔ اس اعلان کے ساتھ دنیا کے تمام پہلوانوں کو اس دنگل میں شرکت اور مقابلہ کرنے کی دعوت دی گئی۔ یہ بھی اعلان کر دیا گیا کہ کشتی گدوں پہ ہوگی اور

مغربی طرف پر ہوگی جس میں جیتنے والے پہلوان کو دو دفعہ اپنے مدِ مقابل پہلوان کو پچھاڑنا لازمی ہوتا تھا۔ جب اس تاریخی دنگل کا اعلان ہوا تو دنیا ہر ملک سے بڑے بڑے طاقتور اور ماہر فن پہلوان "رستم زماں" کا اعز حاصل کرنے کا عزم لے کر لندن پہنچ گئے۔

گاما پہلوان کی لندن کو روانگی

جب گاما نے کشتیوں کے مقابلہ اعلان دیکھا تو ان کے دل میں آ عظیم الشان دنگل میں حصّہ لینے کی خواہش ہوئی آخر کار ان کے ایک جگا دوست سرت کمار نے ان کی مدد کی اور وہ پیرس اور اٹلی ہوتے ہوئے لند جا پہنچے۔ ان کے ہمراہ ان کے چھوٹے بھائی امام بخش پہلوان، احمد بخش پہلوا اور گاما سو پہلوان بھی لندن گئے۔

منتظمین نمائش کا طریقہ انتخاب

منتظمین نمائش نے کشتی کے مقابلہ لیے پہلوانوں کے انتخاب کا ایک مع رکھا تھا جو پہلوان ان کے مقرر کردہ قد، جسم اور وزن (ہیوی ویٹ) معیار پر پورا اتر سکتا تھا اس مقابلہ میں حصّہ لے سکتا تھا۔ چنانچہ دنیا کے ملک سے آئے ہوئے کئی پہلوانوں کا اس معیار پر پورے نہ اترنے کی انتخاب نہ ہو سکا۔ صرف گیارہ پہلوانوں کو "رستم زماں" کا اعزاز حاصل کر منتخب کیا گیا۔ منتظمین نے گاما کو بھی اپنے معیار پر پورا نہ اترنے کی وجہ دنگل میں شریک کرنے سے انکار کر دیا۔

گاما کی جانب سے پانچ پاونڈ کا اعلان

منتظمین کے اس طریقہ کار سے گا پہلوان کو رنج ضرور ہوا لیکن انہ نے ہمت نہیں ہاری اور مایوس نہیں ہوئے کیوں کہ ان کو اپنے فن اور طاقت بھروسہ تھا۔ انھوں نے لندن کے اخبارات میں یہ اعلان شائع کیا کہ دُ کا کوئی بھی پہلوان ان سے مقابلہ کرنے آئے۔ اگر وہ پانچ منٹ میں ا شکست نہ دے سکیں تو پانچ پاونڈ اپنی طرف سے معاوضہ ادا کریں گے

دنیا کے تمام ملکوں سے آئے ہوئے پہلوان لندن میں موجود تھے۔ گاما کے اعلان کے بعد تقریباً دو سو پہلوانوں نے گاما سے مقابلہ کیا لیکن کوئی پہلوان بھی پانچ پاونڈ حاصل نہ کرسکا۔ لندن کے اخبارات نے گاما کی مسلسل غیر معمولی کامیابیوں پر شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا اور ان کے کشتی کے فن کی مہارت پر بڑی تعریف کے اداریے لکھے۔

گاما کا ورلڈ چیمپئن شپ مقابلہ میں انتخاب

گاما کی لندن میں اتنی عظیم کامیابیوں نے منتظمین کمیٹی کو چونکا دیا۔ وہ اپنے اصول اور معیار انتخاب پر نظرثانی کرنے پر مجبور ہو گئے۔ آخر کار ارکان کمیٹی نے گاما پہلوان کو گیارہ ہیوی ویٹ پہلوانوں میں شریک کر لیے جانے کا اعلان کر دیا۔ سچ ہے:

حقیقت خود کو منوا لیتی ہے مانی نہیں جاتی!

لندن کے شفیرڈ بش اسٹیڈیم میں کشتیوں کے مقابلے

اسٹیڈیم میں کشتیوں کے مقابلے دو ماہ تک ہوتے رہے ہر آٹھ دن بعد مقابلہ ہوتا تھا۔ یہ کشتیاں یورپ کے قاعدے کے مطابق گدوں پر ہوتے تھے۔ انگلستان کے قاعدے کے مطابق جیتنے والے پہلوان کو دو دفعہ پچھاڑنا لازمی تھا اور داؤ سے ایسا جکڑنا کہ مدمقابل پہلوان اپنی شکست کا اعتراف کرلے۔ گاما تمام قاعدوں کی پابندی کرتے ہوئے بہت آسانی سے ہر پہلوان کو دو دفعہ فیصلہ کن شکست دے کر ورلڈ چیمپئن شپ کے فائنل میں پہنچ گئے۔ اُدھر مغربی دنیا (پولینڈ) کا سب سے بڑا پہلوان اسٹینے زبسکو مسلسل کامیابیوں کے بعد فائنل مقابلہ کے لیے تیار تھا۔

گاما اور زبسکو کی کشتی

۱۰ ستمبر ۱۹۱۰ء لندن کے اس اسٹیڈیم میں بڑا تاریخی یادگار مقابلہ گاما اور زبسکو کا ہوا۔ تمام دنیا کی نظریں اس کشتی کے انجام پر لگی ہوئی تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مشرق اور مغرب کا وقار اس کشتی کی ہار جیت کے فیصلہ سے وابستہ ہے۔ ابتداء

میں تیس منٹ طاقت اور داؤ پیچ کا مظاہرہ ہوتا رہا اس کے بعد گاما نے ایک داؤ ایسا مارا کہ زبسکو نیچے گر ے اب کے انھوں نے اُٹھنے کی کوشش نہیں کی پہلوانوں کی اصطلاح میں زمین پکڑ کر لیٹ گئے۔ گاما نے زبسکو کو اپنی گرفت میں دبوچ رکھا اور زبسکو کے سارے داؤ پیچ اور زور آزمائی بیکار گئی کشتی شروع ہوئے دو گھنٹے چونتیس منٹ ہو چکے تھے۔ جب زبسکو کو گاما کے گھٹنے کے دباؤ کی برداشت نہ رہی وہ دو گھنٹے نیچے پڑا بلبلاتا رہا آخر کار ریفری سے استدعا کی کہ وہ تھک گئے ہیں اور آئندہ ہفتہ گاما سے دوبارہ مقابلہ کریں گے جج کی رائے کے مطابق رستم یورپ زبسکو کو ایک موقع دیا گیا اور آئندہ ہفتہ گاما سے زبسکو کی آخری کشتی ہو کا اعلان کر دیا گیا۔

دوسرا ہفتہ اور رستم زماں کا اعزاز

دوسرے ہفتہ ۷ ستمبر ۱۹۱۰ء زبسکو اور گاما کا دوسرا فیصلہ کن مقابلہ اسی اسٹیڈیم میں شروع ہونے والا تھا اس تاریخی کشتی کو دیکھنے پورا لندن لوٹ پڑا تھا۔ ٹھیک تین بجے گاما اور زبسکو کے مقابلہ کا اعلان ہوا۔ گاما فوراً اکھاڑے میں پہنچ گئے لیکن زبسکو لاپتہ تھے نام بار بار پکارا گیا۔ آخر کار ریفری نے گاما کا ہاتھ اُوپر بلند کر کے ان کے "رستم زماں" ہونے کا اعلان کیا اور فتح مندی کا نشان بطور سند ایک سنہرا تمغہ گاما کی کمر کو باندھا اس تمغہ پر یونین جیک کا نشان لگا ہوا تھا۔ اور یہ بہت بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا۔

گاما پہلوان رستم زماں کی ہندوستان کو واپسی

ہندوستان لوٹنے سے پہلے گاما نے لندن میں دنیا کے تمام پہلوانوں کو مقابلہ کا چیلنج دیا لیکن کسی کی ہمت ان کے سامنے آنے کی نہ ہوئی۔

ہندوستان اس وقت غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ ایک محکوم قوم کے فرد نے آقاؤں کے دیس میں بغیر سرپرستی فتح اور کامرانی کے جھنڈے گاڑ دیئے تھے اس لیے جب وہ ہندوستان لوٹے تو ان کا ہر جگہ پُرجوش اور شاندار استقبال ہوا اخباروں نے اداریئے لکھ کر انھیں خراجِ تحسین پیش کیا۔

لندن سے آنے کے بعد دو پہلوانوں سے مقابلہ

گاما جب لندن سے پانی کے جہاز میں آرہے تھے تو جہاز میں پھسل کر گر پڑے تھے اور گھٹنے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ پاؤں صرف لمبا رکھ سکتے تھے موڑ نہیں سکتے تھے۔ سخت تکلیف تھی۔ لیکن ہندوستان آنے کے بعد پنجاب کے دیو ہیکل دو پہلوان نے مقابلہ کا چیلنج دیا۔ گاما کے ساتھیوں نے رائے دی کہ علاج کرواکر مقابلہ کریں۔ لیکن گاما نے مشورہ کو نظر انداز کیا اور کہا کہ وہ مقابلہ کریں گے تاکہ دُنیا یہ نہ کہے کہ گاما نے لڑنے سے جی چرایا اور بچنے کی کوشش کی۔ لاہور میں یہ کشتی ہوئی۔ کشتی شروع ہوئی تو صرف دو منٹ میں دو پہلوان زمین پر چت تھے۔

رحیم بخش پہلوان گوجرانوالہ سے چوتھی کشتی

گاما رستم زماں تو ہو گئے تھے لیکن رستم ہند نہ ہو سکے کیوں کہ رحیم بخش پہلوان سے ان کی تین دفعہ کشتی ہوئی اور ہر بار مقابلہ برابری پر ختم ہوا۔ دنیا کا ہر پہلوان گاما کے مقابلہ میں منٹ دو منٹ سے زیادہ نہ ٹھہر سکا صرف رحیم بخش پہلوان ہی ایسے تھے جن سے گاما نے دو دو گھنٹے مقابلہ کیا اور کوئی ہار جیت کا فیصلہ نہ ہو سکا۔ اسی زمانہ میں گاما نے دنیا کے تمام پہلوانوں کو مقابلہ کا چیلنج دیا تھا۔ گاما کے چیلنج کے جواب میں رحیم بخش پہلوان نے مقابلہ کا اعلان کیا۔ بارہ سال کے وقفہ کے بعد ۱۹۱۱ء میں الہ آباد کی ایک صنعتی نمائش کے دنگل میں دو عظیم پہلوانوں گاما اور رحیم بخش پہلوان کا سامنا ہوا۔ پنتالیس منٹ کی زور آزمائی کے بعد گاما نے اپنے پُرانے حریف رحیم بخش کو ایسا پچھاڑا کہ وہ دنگل میں چاروں خانے چت تھے۔ اس طرح رحیم بخش کی فیصلہ کن شکست کے بعد گاما نے بجا طور پر رستم ہند کا خطاب بھی حاصل کر لیا۔

گاما کا ریاست پٹیالہ میں قیام

جب لندن میں کشتیوں کا عظیم الشان دنگل ۱۹۱۰ء میں ہوا تھا تو ریاست پٹیالہ کے مہاراجہ راجہ بھوپندر سنگھ اس زمانے میں لندن ہی میں تھے۔ انھوں نے گاما اور

ان کے بھائی امام بخش کی کشتیوں کے کامیاب جرت انگیز مقابلوں کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا اور متاثر ہوئے تھے۔ جب راجہ ہندوستان لوٹے تو انھوں نے گاما اور امام بخش پہلوان کو پٹیالہ آنے کی دعوت دی اور ان سے خواہش کی کہ گاما اور ان کے بھائی امام بخش مستقل طور پر پٹیالہ میں قیام کریں اور اپنے اہل و عیال کو بھی وہاں بلالیں۔ چنانچہ گاما نے راجہ کی خواہش کا احترام کیا اور پٹیالہ میں سکونت اختیار کی۔ راجہ نے گاما اور ان کے بھائی کا ڈھائی ڈھائی سو وظیفہ مقرر کر دیا اور رہنے کے لیے ایک اچھا مکان مفت عنایت کیا راجہ بھوپندر سنگھ کشتی کے بڑے قدر داں اور دل دادہ تھے اس فن کو ترقی دینے اور پہلوانوں کے ساتھ جو قدر دانی انھوں نے کی اس کی مثال نہیں ملتی۔

ریاست پٹیالہ میں چندن سنگھ پہلوان سے مقابلہ

ریاست پٹیالہ میں راجہ کی سرپرستی میں پچیس ۲۵ پہلوان موجود تھے اس ریاست کے پہلوان چندن سنگھ کی بڑی شہرت تھی۔ راجہ کی خواہش پر گاما نے چندن سنگھ پہلوان سے کشتی لڑی۔ گاما کو چندن سنگھ کو چت کرنے میں تین منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔

زبسکو کی گاما سے دوسری بار کشتی

لندن کی شکست کا بدلہ لینے پولینڈ کے چمپئن زبسکو اٹھارہ سال بعد ۱۹۲۸ء پٹیالہ آئے جہاں راجہ کی سرپرستی میں گاما مقیم تھے زبسکو کا خیال تھا کہ اس طویل عرصہ میں گاما ضعیف ہو چکے ہوں گے اور ان کے وہ کس بل باقی نہ ہوں گے مہاراجہ پٹیالہ نے ازراہ قدر دانی زبسکو کو آمد و رفت کے اخراجات کے علاوہ چالیس ہزار روپیہ دینے کا بھی اعلان کیا۔ گاما نے اس چیلنج کو قبول کیا اور جو شرائط زبسکو نے رکھے سب منظور کئے البتہ گاما نے صرف ایک شرط رکھی کہ لال مٹی پر کشتی ہوگی۔ جسے زبسکو نے تسلیم کر لیا۔ کیوں کہ انھیں یقین تھا کہ وہ گاما کو اب کی بار بہت آسانی سے زیر کر لیں گے۔ کشتی دیکھنے ڈیڑھ لاکھ تماشائی موجود تھے جب کشتی شروع ہوئی تو پلک جھپکتے ہی زبسکو زمین پر چت تھے۔ گاما نے

اپنے ایک انٹرویو میں اس کشتی کے بارے میں کہا تھا کہ جس نے گھڑی دیکھی اور جس نے سگریٹ سلگایا اس نے کشتی نہیں دیکھی۔

گاما اور پٹرسن رستم فرانس کا مقابلہ

جب مہاراجہ پٹیالہ فرانس گئے تو وہاں کے دیو ہیکل مشہور پہلوان پٹرسن نے ان سے ملاقات کر کے بتایا کہ لندن کے ورلڈ چمپئن شپ مقابلہ میں وہ شریک نہ ہوسکے اور مفت میں گاما کو رستم زماں کا اعزاز مل گیا۔ پٹرسن نے بتایا کہ جب تک گاما اس سے مقابلہ کر کے شکست نہ دیں رستم زماں نہیں ہوسکتے۔ راجہ بھوپندر سنگھ نے کمال فیاضی سے پٹیالہ آنے اور گاما سے مقابلہ کرنے کی دعوت دی۔ اخراجات کے علاوہ بیس ہزار روپے دینے کا بھی وعدہ کیا۔ ۲۴ فروری ۱۹۲۹ء پٹیالہ میں پٹرسن اور گاما کا چیلنج مقابلہ ہوا۔ پٹرسن بہت طاقتور پہلوان تھا لیکن صرف تین منٹ میں اس کشتی کا فیصلہ ہوگیا اور پٹرسن ایک دھاکے کے ساتھ زمین پر چت پڑ گیا۔

پٹرسن کے بعد دنیا کے کسی پہلوان نے گاما سے مقابلہ نہیں کیا

کئی بار گاما نے ان سے مقابلہ کرنے دنیا کے پہلوانوں کو چیلنج کیا لیکن کسی نے ان سے کشتی لڑنے کی جرأت نہیں کی۔ اس لیے گاما دنیا کی وہ عظیم شخصیت تھے جو کشتی کی دنیا سے ناقابل شکست چمپئن کی حیثیت سے بڑی شان اور آن سے ریٹائرڈ ہوئے۔

پہلی مرتبہ گاما پہلوان رستم زماں کی حیدرآباد میں آمد

آصف سابع نواب میر عثمان علیخاں کے دونوں شہزادوں والا شان نواب اعظم جاہ اور والا شان نواب معظم جاہ کی شادی ترکی شہزادیوں سے یورپ میں ہوئی۔ شادی کے بعد جب شہزادے اپنی دلہنوں کے ساتھ حیدرآباد لوٹے تو رعایا اور حکومت کی جانب سے ان کا شایان شان استقبال ہوا۔ اس مسرت میں موسیقی، گیمس وغیرہ کے کئی پروگرام ہوئے اس موقع پر شاندار دنگل کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس دنگل میں شرکت

کے لیے ہندوستان کے کئی پہلوانوں کو حیدرآباد بلایا گیا تھا۔ چنانچہ گاما پہلوان اسی سلسلہ میں پہلی مرتبہ یکم جنوری ۱۹۳۲ء حیدرآباد تشریف لائے۔ ان کا قیام حیدرآباد میں مکہ مسجد کے سامنے "بیگم کی مسجد" کے بالکل قریب ایک مکان میں رہا جو استاد عیسیٰ کی تعلیم سے بہت قریب تھا۔ استاد عیسیٰ حیدرآباد کے ایک بڑے پہلوان تھے۔ گاما کی تعلیم کے دو پہلوانوں قمرالدین پہلوان اور فتح دین پہلوان سے مراسم دوستی قائم رہنے کی وجہ گاما پہلوان کا غائبانہ تعارف استاد عیسیٰ سے تھا۔ استاد عیسیٰ کا انتقال ہو چکا تھا لیکن ان کے فرزند محمد بن عیسیٰ پہلوان سے گاما پہلوان کا ربط قائم ہو چکا تھا چنانچہ گاما پہلوان نے کسی عالیشان ہوٹل میں ٹھہرنے کی بجائے ــــــ استاد عیسیٰ کی تعلیم کے قریب ہی مکان میں اپنے ساتھ آئے ہوئے پچیس پہلوانوں کے ساتھ قیام کرنا پسند کیا۔ حیدرآباد میں گاما پہلوان سے کسی کے مقابلے کا سوال ہی نہ تھا۔ چنانچہ گاما پہلوان اور ان کے بھائی امام بخش پہلوان نے یوسف بازار (نیا پل) کے دنگل میں زور آزمائی اور فن کا مظاہرہ کر کے یہاں کے شائقین کو لطف اندوز کیا۔ ایک ہفتہ گاما پہلوان کا یہاں قیام رہا اس عرصہ میں گاما پہلوان نے استاد محمد بن عیسیٰ کو اپنی شاگردی کا شرف بخشا۔ یہی وجہ ہے کہ عیسیٰ استاد کے اکھاڑے کو گاما پہلوان کا اکھاڑہ بھی کہتے ہیں۔

دوسری مرتبہ حیدرآباد میں!

انگریزوں کے دور میں جنگی امداد کے سلسلہ میں ہندوستان میں ہر جگہ "کارنوال" ہوتے تھے چنانچہ حیدرآباد میں ایک کارنوال "کارروان" کے نام سے بمقام بازی گاہ بیت آباد (پیپلز حسین ساگر) قائم ہوا تھا۔ تفریحات کے کئی پروگرام اس میں سے اس زمانہ میں کشتی کا دنگل ہر نمائش کا ایک لازمی جز تھا۔ اس سلسلہ میں کارنوال کمیٹی نے ایک بڑے دنگل کا اہتمام کیا۔ چنانچہ ہندوستان اور یورپ سے چار سو پہلوانوں نے اس دنگل میں حصہ لیا۔ استاد محمد بن عیسیٰ صاحب پہلوان کی سفارش کی بناء پر گاما پہلوان دوسری مرتبہ اس دنگل میں حصہ لینے

۱۹۴۱ء حیدرآباد تشریف لائے۔ منتظمین نمائش کی خواہش کو نظر انداز کر کے گاما پہلوان نے دوسری مرتبہ بھی استاد عیسیٰ کی تعلیم کے قریب ٹھہرنا ہی نا پسند کیا۔ اب کے بھی ان کے ساتھ اور پہلوانوں کے علاوہ رستم ہند امام بخش چھوٹا گاما پہلوان، حمیدہ پہلوان، نواب پہلوان، بھولو پہلوان، اسلم پہلوان، اکرم پہلوان، اعظم پہلوان اور حسو پہلوان بھی تھے۔ استاد محمد بن عیسیٰ پہلوان نے اس مرتبہ ان تمام پہلوانوں کی مہمان نوازی کے فرائض بڑی سیر چشمی اور فراخدلی سے ادا کئے جو ایک یادگار بات ہے۔ ایک ماہ وہ یہاں رہے۔ گاما پہلوان سے تو کسی کا مقابلہ اس کاروان دنگل میں نہیں ہوا البتہ ان کے ساتھ آئے ہوئے پہلوانوں کے مقابلے دوسرے پہلوانوں سے ہوئے تھے۔ گاما پہلوان نے اب کے بھی اپنے بھائی امام بخش سے دنگل میں داؤ پیچ کا مظاہرہ کر کے دلدادگان کشتی کو خوش کیا۔

گاما پہلوان کی شادی

گاما پہلوان نے اٹھائیس سال کی عمر میں گاموں پہلوان کی صاحبزادی نواب بیگم سے لاہور میں شادی کی شادی کے تین سال بعد نواب بیگم کا انتقال ہو گیا ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ دوسری شادی ان ہی گامو پہلوان کی دوسری صاحبزادی وزیر بیگم سے قرار پائی جن سے پانچ لڑکے اور چار لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ تمام لڑکوں کا انتقال ہو گیا لڑکیاں بقید حیات رہیں۔ گاما کی ایک لڑکی رشیدہ اختر کی شادی ان کے بھائی رستم ہند امام بخش پہلوان کے فرزند بھولو پہلوان سے ہوئی۔

گاما پہلوان کا پاکستان منتقل ہونا

۱۹۴۷ء میں ہندوستان انگریز کے طوق غلامی سے آزاد ہو گیا۔ دو قومی نظریہ کی بنیاد پر ملک کی تقسیم ہو گئی اور بھارت اور پاکستان دو علحدہ مملکتیں وجود میں آئیں۔ تقسیم کے نتیجہ میں دونوں طرف کی آبادی کو نقل مقام کا مرحلہ پیش آیا۔ فرقہ پرستوں نے فسادات کی آگ بھڑکا دی۔ بھارت اور پاکستان میں لوٹ مار قتل و غارت گری کے شرمناک اور بھیانک واقعات

رونما ہوئے۔

گاما اور اُن کا خاندان بھی متاثر ہوا۔ جان و مال کا جب خطرہ لاحق ہوا تو وہ ترکِ وطن پر مجبور ہو گئے۔ وہ اور ان کا خاندان پٹیالہ سے لاہور پاکستان روانہ ہوا۔ ان کا قیام لاہور میں رہا۔

گاما پہلوان کی بیماری

سنہ ۱۹۵۵ء گاما پہلوان کو دل کا دورہ پڑا اور پھر ان کو دمہ بھی ہو گیا یہ صدر پاکستان ایوب خاں کا زمانہ تھا۔ میور ہاسپٹل میں ان کے علاج کا انتظام ہوا۔ ان کا وظیفہ مقرر کر دیا گیا۔ "تمغۂ امتیاز" کے ساتھ پانچ ہزار کا انعام دیا گیا۔ لیکن بتدریج ان کی صحت گرتی گئی۔ دل کے دورے بھی پڑے مسلسل سات مہینے بسترِ بیماری پر رہے۔ دنیا کا طاقت ور پہلوان اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ سلام کا جواب بھی ہاتھ اُٹھا کر دینے کے قابل نہ رہا اور جسم پر بیٹھی ہوئی مکھی بھی اُڑانے کی سکت نہ رہی۔ ناقدر دانی کے باعث معاشی حالت بھی خراب ہوتی گئی۔

گاما پہلوان کا انتقال

۲۲ رمئی سنہ ۱۹۶۰ء کی شام ان کو دل کا سخت دورہ پڑا اور دوسرے دن دوشنبہ ۲۳ رمئی سنہ ۱۹۶۰ء ان کے قلب کی حرکت بند ہو گئی۔ ان کا انتقال اپنے مکان موہنی روڈ لاہور میں ہوا۔ وفات کے وقت ان کی عمر ۸۲ سال تھی ان کی وصیت کے مطابق ان کی تدفین حضرت پیر مکی رحؒ کے قبرستان میں مغرب کے فوراً بعد ہوئی۔

گاما پہلوان کی سیرت

اگر ہم گاما پہلوان کی سیرت و کردار کا مطالعہ کریں تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ طاقت اور داؤ پیچ کے فن ہی کے رستم زماں نہ تھے بلکہ اعلیٰ اخلاق اور بلند کرداری میں بھی تمام دنیا کے پہلوانوں کے مقابلہ میں "اخلاق کے رستم زماں" کا اعزاز ان کو حاصل ہے۔ سینہ تان کر سر اونچا کر کے چلنا ان کو آتا نہ تھا ہمیشہ ان کی نگاہیں نیچی رہیں اور گردن جھکی ہوئی۔ اونچی آواز سے بات نہ کرتے بلکہ نرمی اور ملائمت سے گفتگو کرتے کسی سے جھگڑا تو بڑی بات ہے کسی کو

غصہ اور ڈانٹ ڈپٹ تک کرتے بھی نہیں دیکھا۔ غرور اور تکبّر ان میں نام کو نہ تھا شکست خوردہ پہلوانوں کا ذکر عزت سے کرتے اور ان سے اخلاق سے ملتے۔ شراب انھوں نے کبھی نہیں پی۔ پابند صوم وصلوٰۃ تھے اور متقی اور پرہیز گار بھی۔ زندگی بہت سادہ تھی ہمیشہ سادہ مقررہ لباس ہی پہنا۔ گالی گلوج اور فحش کلامی سے کبھی ان کی زبان آلودہ نہیں ہوئی وہ ہمیشہ شائستگی اور اخلاق کا نمونہ بنے رہے۔ اس کے ساتھ زندہ دلی اور خوش مزاجی ان کی سرشت میں تھی اہل کمال کو اپنے کمال وفن پر ناز ہوتا ہے لیکن گاما پہلوان فن اور شہرت کی بلندیوں پر پہنچ جانے کے باوجود اپنے کمال پر غرور نہیں کیا کسی نے پوچھا کہ آپ کی کامیابی کا کیا راز ہے تو جواب دیا اللہ کی مہربانی کے سوا کچھ نہیں"۔ (کتاب رستم زماں گاما)

گاما پہلوان کی عظمت

کشتی کا فن دیگر فنون کی طرح ایک قدیم ترین فن ہے۔ ہر ملک اور ہر جگہ پہلوانوں کی عزت اور قدر و منزلت تھی۔ اہلِ ملک اپنے شہ زور پہلوانوں پر فخر و ناز کرتے تھے تاریخ کی کتابوں اور شاعروں کے اشعار میں ان کے کارناموں کی داستان محفوظ ہے لیکن گاما پہلوان کوئی افسانہ نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے گاما پہلوان جب پیدا ہوئے تو ہندوستان انگریزوں کے زیرِ اقتدار بدترین غلامی کے دور سے گزر رہا تھا اپنی ذاتی دلچسپی اور محنت سے وہ فن کشتی کے بام عروج پر پہنچے اور پھر آقاؤں کے شہر لندن میں یورپ کے دیو ہیکل اور شہ زور پہلوانوں کو منٹوں میں شکست دے کر "رستم زماں" کا اعزاز اپنے آقاؤں ہی سے حاصل کیا۔ اپنے فن میں یگانہ روزگار ہونے کے ساتھ ان کی شخصیت اور سیرت میں ایسی خوبیاں تھیں کہ آج بھی ان کے لیے عزت اور فخر کا جذبہ موجود ہے ہند و پاک کے بلند مرتبہ عالمِ دین حضرت ابوالحسن علی ندوی صاحب مدظلہ عالی جب پہلی مرتبہ لاہور گئے تو اپنے سفرنامہ میں لکھا:۔

"علمی و ادبی محفلوں میں شریک ہوا۔ رستم زماں گاما پہلوان اور بعض ہندوستان گیر اور بعض عالمگیر شہرت رکھنے والے اہل کمال کی زیارت کی"۔

(پرانے چراغ جلد اول)

ہندوستانی طرز کی کشتی لڑنے کا دور ختم ہوگیا اب اگر کہیں ہے بھی تو اس کا حال بجھتے چراغ کی طرح ہے۔ لیکن ہر دور کا مورخ گاما پہلوان رستم زماں اور ان کے فن پر تحسین آفرین کے پھول نچھاور کرے گا۔

قاری اُستاد محمدؐ بن عیسیٰ پہلوان

باقیات الصالحات اور دکن کی یادگار بزرگ شخصیت جناب استاد محمد بن عیسیٰ صاحب پہلوان اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ ان کے انتقال سے حیدرآباد دکن میں فنِ پہلوانی کا تاریخی اور معلومات افزا باب ختم ہوگیا۔

استاد محمد بن عیسیٰ کا تعلق ملک عرب کے اس قبیلہ سے ہے جو اپنے وطن حضرموت سے بعہد اعلیٰ حضرت غفران مکان نواب میر محبوب علیخاں وارد حیدرآباد ہوا۔ ان کے جد بزرگوار عفیف بن علی الیافعی صاحب اپنے تین فرزندوں صالح بن عفیف، عیسیٰ بن عفیف اور عبداللہ بن عفیف کے ساتھ حیدرآباد کو اپنا مسکن بنایا اور محکمہ نظم جمعیت سرکار عالی حکومت حیدرآباد میں ملازمت اختیار کی۔ ان کے دوسرے فرزند عیسیٰ بن عفیف کی عمر اس وقت صرف سات سال تھی۔ پہلے وہ مدرسہ نظامیہ میں زیرِ تعلیم رہے بعد از ان وہ بھی اسی محکمہ نظم جمعیت میں ملازم ہو گئے۔ ان کی شادی ایک شریف و معزز عرب گھرانے میں جناب صلاح بن یحییٰ الیافعی صاحب کی صاحبزادی سے ہوئی جو حیدرآباد کے مشہور محقق جناب عمر الیافعی صاحب کی خواہر تھیں جن کے بطن سے تین فرزند محمد بن عیسیٰ، علی بن عیسیٰ اور عفیف بن عیسیٰ اور ایک صاحبزادی تولد ہوئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب حیدرآباد میں امراء کی قدردانیوں اور سرپرستی کی بدولت فنِ کشتی کا بڑا شہرہ تھا۔ کشتی کو ایک شریفانہ فن سمجھا جاتا تھا۔ خواص و عوام اس فن کے بڑے شائق اور دل دادہ تھے یہی وجہ ہے کہ حیدرآباد میں اس

فن کے استاد، ان کی تعلیم اور اکھاڑے موجود اور مشہور تھے۔ شمالی ہند سے کئی نامی گرامی پہلوان یہاں کے دنگل میں حصہ لینے اور قدر دانی کی اُمید لے کر آتے تھے۔ استاد عیسیٰ کو کشتی اور زور آزمائی کا فطری شوق تھا اپنے اسی جذبۂ شوق کی بناء پر وہ استاد فخرالدین دہلوی کے شاگرد ہوئے جن کا قیام ان دنوں حیدرآباد میں تھا۔ بہت جلد اپنی ذاتی دلچسپی سے کشتی کے داؤ پیچ سیکھے اور دور و نزدیک کامیاب کشتیاں لڑ کر نام آور ہوئے اور پھر فن کشتی کے استاد کی حیثیت سے ان کی شہرت ہوئی۔ امیر پائیگاہ نواب ولی الدولہ اور نواب صاحب کلیانی قدر دان تھے اور سرپرستی کرتے تھے۔ ان کی "تعلیم" اور اکھاڑے کا شمار حیدرآباد کے مشہور اکھاڑوں میں ہوتا ہے چنانچہ تاریخ "مملکت آصفیہ" جلد اول ص ۴۲۸ مطبوعہ پاکستان میں درج ہے: "یوں تو بلدہ حیدرآباد اور اضلاع میں ہزاروں اکھاڑے تھے مگر بلدہ کے دو اکھاڑے سب سے زیادہ مشہور تھے عیسیٰ پہلوان کا اکھاڑا اور ملّر کی تعلیم"۔ استاد عیسیٰ ایک ماہرِ فن پہلوان ہونے کے ساتھ قدر دان فن بھی تھے اور خاص بات یہ کہ عربوں کی مہمان نوازی کا امتیازی وصف بھی ان میں تھا چنانچہ شمالی ہند سے آنے والے پہلوانوں کی ان کے ہاں زیادہ ریل پیل رہتی تھی۔ شمالی ہند (پنجاب) کے دو پہلوان قمرالدین پہلوان اور فتح دین پہلوان جن کا تعلق گاما اکھاڑے سے تھا جب بھی حیدرآباد آتے ان کا قیام طعام استاد عیسیٰ کے ہاں رہتا۔ ان پہلوانوں کی وجہ رستم زماں گاما اور رستم ہند امام بخش سے استاد عیسیٰ کا غائبانہ تعارف ہوا۔ جب استاد عیسیٰ کا ۱۳۴۷ھ انتقال ہوا تو رستم زماں گاما کی نظرِ عنایت ان کے فرزند محمد بن عیسیٰ پر رہی۔ قمرالدین پہلوان ہی نے حیدرآباد میں استاد پہلوانوں کی موجودگی میں محمد بن عیسیٰ کی دستار بندی کی اور ان کو اپنے والد استاد عیسیٰ کا جانشین بنایا۔

بتقریب شادی شہزادگان والا شان اعظم جاہ ولی عہد دولتِ آصفیہ معظم جاہ حیدرآباد میں ایک شاندار جشن منایا گیا تھا۔ مختلف اسپورٹس، موسیقی

کے پروگرام، نمائش اور مشاعرے سب ہی ہوئے۔ اس جشن کو یادگار بنانے کے لیے ارکان کمیٹی نے پہلوانوں کے ایک عظیم الشان دنگل کا اہتمام کیا، حیدرآباد اور ہندوستان کے بڑے پہلوانوں کے اس دنگل میں شریک ہونے کا انتظام ہوا۔ ارکان کمیٹی کی درخواست پر استاد محمد بن عیسیٰ نے گاما پہلوان، امام بخش پہلوان اور حمیدہ پہلوان کو اس تاریخی دنگل میں شرکت کی سفارش کی چنانچہ جنوری ۱۹۳۲ء یہ نامور پہلوان پہلی مرتبہ حیدرآباد آئے۔ گاما پہلوان نے کسی ہوٹل یا کسی جگہ ٹھہرنے کی بجائے استاد کے گھر اور عیسیٰ تعلیم کے قریب ہی ٹھہرنے کو ترجیح دی یہاں ان کا قیام صرف ایک ہفتہ رہا اس مختصر مدت میں خاص بات یہ رہی کہ گاما پہلوان نے استاد محمد بن عیسیٰ کو اپنی شاگردی کا شرف بخشا۔

جنگی امداد (وار فنڈ) کے سلسلے میں انگریزی راج میں جگہ جگہ بڑے شہروں میں کارنیوال ہوئے حیدرآباد میں بھی کارنیوال اور نمائش کا انتظام ہوا۔ اس کارنیوال میں کئی تفریحی پروگرام شامل تھے اس زمانے میں بغیر کشتی مقابلہ کوئی بڑی تقریب یا نمائش نامکمل سمجھی جاتی تھی۔ اسی اہمیت کے پیش نظر منتظمین کارنیوال نے اس کارنیوال میں پہلوانوں کے دنگل کا بھی اہتمام کیا۔ یہ یادگار دنگل "کارنوال دنگل" کے نام سے مشہور ہے اس دنگل میں حصہ لینے ہند اور بیرون ہند (یورپ) سے کئی نامور پہلوان آئے تھے۔ جن کی تعداد چار سو تھی۔ اس دنگل کو یادگار بنانے کے لیے منتظمین نے رستم زماں گاما پہلوان اور ان کے بھائی رستم ہند امام بخش پہلوان کی شرکت کو بہت ضروری سمجھا چنانچہ گاما پہلوان اور امام بخش پہلوان دوسری مرتبہ ۱۹۴۲ء لاہور سے حیدرآباد تشریف لائے۔ منتظمین نے ان کے اور ان کے ساتھ آئے ہوئے پچیس ۲۵ پہلوانوں کے قیام و طعام کا انتظام ہوٹل میں کیا تھا لیکن گاما پہلوان کی اعلیٰ ظرفی تھی کہ اپنے آرام اور سہولتوں کو نظر انداز کر کے انھوں نے دوسری مرتبہ بھی ازراہِ قدر افزائی استاد کے مکان اور تعلیم کے قریب ایک مکان میں اپنے ساتھ آئے ہوئے پہلوانوں سمیت قیام کرنا مناسب جانا یہاں ان کا قیام ایک ماہ رہا۔ استاد محمد بن عیسیٰ کی شخصیت کا بڑا تابناک پہلو یہ بھی ہے کہ عرب

کی مہمان نوازی کا وصف ان میں بدرجہ اتم موجود تھا۔ یہی وجہ تھی کہ گاما پہلوان اور ان کے ساتھی دیگر پہلوانوں کی دو دفعہ جس سیر چشمی اور فراخ دلی سے مہمان نوازی کی اس کی مثال نہیں ملتی۔ گاما پہلوان پر کئی کتابیں اور مضامین لکھے گئے ہیں مگر ـــــ گاما پہلوان کے دو دفعہ حیدرآباد آنے اور ان کے قیام کا کسی نے بھی کچھ ذکر نہیں کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ جس تعلیم کی مٹی پر رستم زماں گاما، امام بخش، حمیدہ پہلوان، چھوٹا گاما، بھولو پہلوان اور برادران بھولو کا پسینہ ٹپکا ہو یقیناً وہ ایک یادگار اور قابل احترام تعلیم اور ورزش گاہ ہے۔ استاد محمد بن عیسیٰ نے فن کشتی کو زندہ اور برقرار رکھنے اور نوجوانوں میں کشتی کے شوق کے ابھارنے میں بڑے قابل قدر خدمات انجام دیتے ہیں جو تاریخ دکن میں زریں حروف میں لکھے جائیں گے ہندوستان اور حیدرآباد کے مشہور پہلوانوں کے حالاتِ زندگی، ان کی فنِ پہلوانی میں مہارت، ان کی کشتیوں میں ہار جیت کے راز ہائے سربستہ چشم دید کشتی کے مقابلہ اور داؤ پیچ کی نزاکتوں سے وہ اس درجہ واقف تھے گویا اس فن کی جیتی جاگتی تاریخ ہیں۔ لاتعداد شاگرد تھے لیکن جن شاگردوں نے استاد کے نام کو روشن کیا ان میں حاجی پہلوان، سالم پہلوان، علی لرزی پہلوان، افسر پہلوان، شیخ صالح پہلوان، صمد خاں پہلوان، قمرالدین خاں عرف چاند پہلوان، مقبول پہلوان اور محمد پہلوان بہت مشہور ہوئے۔ کشتی ایک ایسا فن ہے جس میں فرقہ پرستی کو دخل نہیں اور نہ ہندو مسلمان کا بھید بھاؤ ہے۔ استاد چاہے کسی فرقہ کا ہو اس کی بڑی عزت و تعظیم کی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ استاد کی حیدرآباد اور حیدرآباد کے باہر بڑی توقیر و عزت تھی خوبیٔ قسمت سے مجھے استاد محمد بن عیسیٰ کی صحبت میں بیٹھنے اور انھیں قریب سے دیکھنے کے مواقع نصیب ہوئے۔ گزرے ہوئے پہلوانوں کا ذکر جاہے وہ کسی فرقہ کے ہوں ان کا عزت سے نام لیتے اور ان کے فن کی تعریف کرتے تھے۔ کولہاپور سے جب بھی ہندو پہلوان حیدرآباد آتے تو وہ ضرور استاد سے ملتے تھے اور استاد ان سے بڑی

محبت سے ملتے اور ان کی خاطر مدارت کرتے۔ حیدر آباد کے اکھاڑوں اور یہاں کے استادوں میں استاد کی ایک منفرد و مسلّمہ شخصیت تھی ان کی رائے کا بڑا احترام کیا جاتا تھا۔

استاد محمد بن عیسیٰ کو پہلوانی کا شوق ورثہ میں ملا تھا اور وہ اس فن کے استاد مانے گئے اسی کے ساتھ قرآن خوانی سے ان کا شغف اور قرأت و تجوید سے ان کا ذوق فضلِ ربّانی تھا انھوں نے باقاعدہ تجوید کی تعلیم حاصل کی تھی پہلے حضرت قاری سلیم معتیب کے شاگرد ہوئے اس کے بعد تاج القرأ حضرت قاری محمد تاج الدین صاحبؒ کے آگے زانوے ادب تہ کر کے قرأت سیدنا عاصم کوفیؒ، قرت سبعہ، قرت عشرہ مکمل کی اور صاحب سند ہوئے۔ ان کا محبوب مشغلہ علم تجوید و قرت کی تعلیم تھا۔ بیگم کی مسجد واقع رو برد مکّہ مسجد درسِ قرآن کا مدرسہ قایم کیا تھا بعد نمازِ فجر بلا معاوضہ بچے اور بچیوں کو قرآن پڑھانے کا سلسلہ برسوں جاری رکھا اور آخر آخر میں بوجہ ضعیفی اپنے گھر پر قرآن پڑھانے میں اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ اللہ کے کرم سے یہ سعادت ان کو ملی جو قیامت تک ایک ثواب جاریہ اور ان کی بخشش اور مغفرت کی ضامن ہے۔

اپنے استاد حضرت قاری محمد تاج الدین صاحبؒ سے بڑی والہانہ عقیدت رکھتے تھے حضرت کا انتقال ہوا تو بہت متاثر تھے۔ تدفین کے وقت زمین پر وہیں بیٹھ گئے ان کے عقیدت مند اور میرے دوست فیاض الدین صابری بھی ساتھ تھے۔ جب میّت لحد میں اتاری جا رہی تھی تو مجھ سے کہا: "اجی حضت وہ صفی صاحب کا کیا شعر ہے: صفی استاد کا اور باپ کا رتبہ برابر ہے" ابھی دوسرا مصرعہ میری زبان پہ آیا ہی تھا کہ دیکھا بے ساختہ آنکھوں سے آنسو رواں ہیں۔ میں اس جذبۂ عقیدت مندی اور محبت کو دیکھ کر بہت متاثر اور حیرت میں پڑ گیا کیوں کہ وہ شخص جس کی آنکھ سے اپنے دو جوان بیٹوں کے یکے بعد دیگرے انتقال کر جانے پہ ایک قطرہ بھی آنسو

سکا نہ ٹپکا ہو اور جو تسلیم و رضا کی مثالی تصویر بنا رہا وہ اسّی برس کا بوڑھا اپنے عمر رسیدہ استاد کی موت پر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا ہے! یہی سعادت مندی کا جذبہ تھا کہ ہر رمضان میں اپنے والد کی سالانہ فاتحہ اور اسی طرح گاما پہلوان کے ایصالِ ثواب کا اہتمام ہر سال باقاعدگی سے کرتے تھے۔

استاد مرحوم بڑی خوبیوں کا مجموعہ تھے۔ بزرگوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت ان کا وطیرہ تھا۔ ہمیشہ دوستوں سے خلوص و محبت کا برتاؤ کرتے اور ان کی خاطر مدارات میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے اور ہر قسم کی مدد کے لیے آمادہ رہتے۔ صاف گو تھے اور ریا کاری شعار نہ تھا۔ کشادہ دل اور کھلے ہاتھ کے تھے۔ یہ خاص بات تھی کہ اللہ نے نازک حالات میں ان کی بند مٹھی کا بھرم رکھا۔ خود دار ایسے کہ تنگی حالات میں اپنی مجبوریوں کا کسی سے کوئی ذکر نہ کرتے۔ کوہ غم ان پر ٹوٹ پڑے مگر وہ تسلیم و رضا کی چٹان بنے رہے اور ہر وقت زبان پہ اللہ کی نعمتوں اور احسانوں کا شکر رہتا تھا۔ وضع داری کا یہ حال تھا کہ دنیا نے ان کو ہمیشہ ایک رنگ اور ایک حال میں دیکھا۔ جس نے ان کو ہمیشہ خوش حال اور زندہ دل پایا۔ ان کی صحبت میں بیٹھ کر آدمی غم بھول جاتا تھا۔ انھوں نے پہلوانی کے شریفانہ فن کی تادمِ آخر لاج رکھی غنڈہ گردی، داداگیری اور جائز ناجائز کا روبار سے سخت نفرت تھی۔ اپنے فائدہ کے لیے شاگردوں کو کبھی آلہ کار نہیں بنایا۔ ان کے شاگرد بھی اپنے استاد کے جذبات اور طریقۂ کار کا احترام کیا اور اکھاڑے کی نیک نامی پر حرف آنے نہیں دیا۔ استاد کی ایک صفت یہ بھی تھی کہ دولت کی ہوس ان کو نہیں تھی بلکہ اللہ کی رضا جوئی اور اللہ کی راہ میں خرچ کر دینے کا جذبہ تھا۔ بیگم کی مسجد کے لیے دو قیمتی بلوری جھاڑ اور آٹھ قیمتی کنول لگائے اور کئی قلمی و غیر مطبوعہ کتب مع خوب صورت الماری کا تحفہ اس مسجد میں پیش کیا۔ کتابوں سے بہت دل چسپی تھی اور اس فن میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ کھارا ہو یا میٹھا

د اپنے ہاتھ سے اس خوبی سے پکاتے کہ کیا کوئی پکا سکے گا۔ ان کو دیکھ کر
ر لوں کی مہمان نوازی کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ ہم نے امیروں اور دولت مندوں
ے ہاں بھی کھایا ہے لیکن استاد کے تیار کردہ غذاؤں اور ان کے خلوص
ے آگے سب کے دسترخوان پھیکے نظر آئے۔

استاد کے صرف دو صاحبزادے تھے لیکن افسوس ان دونوں کا جوانی
ں جدہ میں انتقال ہوگیا۔ استاد اپنے پوتروں کی خواہش پر بتاریخ ۴ راپریل
۱۹ء عمرہ کے لیے جدہ روانہ ہوئے تھے وہیں رہ جانے کا ارادہ تھا لیکن
ہاں رہنے کا موقع نہ مل سکا اس لیے چند ماہ رہ کر حیدرآباد واپس ہوگئے۔
جدہ جاتے وقت اپنا قدیم وذاتی مکان فروخت کر دیا تھا اس لیے اپنی
حلیم" ہی میں ٹھہر گئے اس موقع پر ان کے دل پر کیا گزری اللہ ہی بہتر جانتا
ہے لیکن ایسے خوش رہے کہ اپنی دلی کیفیات کا احساس کسی کو ہونے نہیں
دیا۔ اللہ جب کسی پر کرم کرنا چاہتا ہے تو اپنے کسی بندہ کو اس کا ذریعہ
بنا دیتا ہے۔ ان کے عزیز شاگرد مقبول پہلوان (بارکس) نے تعلیم کے سامنے
یک مختصر سی مدت میں آر سی سی کا موزوں اور آرام دہ مکان اپنے ذاتی صرفہ
سے صرف اخلاص اور جذبہ سعادت مندی سے استاد کے لیے تعمیر کیا اور آخر
وقت تک مقبول پہلوان نے جس طور سے حق شاگردی و خدمت گزاری
کے فرائض انجام دیئے اس کی مثال مشکل سے ملے گی اس مکان میں استاد
چند آخری مہینے زندگی کے نہایت اطمینان و سکون کے بسر کئے۔ اچھے
خاصے تھے ایک دن طبیعت خراب ہوئی اور بے ہوش ہوگئے۔ اس بے ہوشی
ہ چار دن دواخانہ درشہوار میں شریک رہ کر رات گیارہ بجے بتاریخ ۲۲
روری ۹۱ء بعمر ۸۵ سال انتقال کر گئے۔ دوسرے دن نماز جنازہ مکہ مسجد
میں ادا ہوئی اور ان کی وصیت کے مطابق تدفین درگاہ حضرت شجاع الدین
صاحبؒ عیدی بازار میں عربی کے ادیب و شاعر سید ہاشمی حضرت حبیب عبداللہ
المدیحج علوی صاحب کے پہلو میں ہوئی۔

استاد اس دنیا میں نہیں رہے لیکن ان کی یادوں کے چراغ ان لوگوں کے دلوں میں روشن رہیں گے جن کو ان سے ربط اور تعلق خاطر تھا۔!

قطعہ تاریخ وفات رستم زمان گاما پہلوان

رستم زمان گاما پہلوان کی وفات کی خبر سن کر دکن کے نامور تاریخ گو شاعر جناب حکیم خواجہ شفیع حسن ابوالعلائی صاحب عارف نے جو پُر اثر تاریخ کہی تھی وہ حسب ذیل ہے:

تمام عمر کسی پہلوان سے چت نہ ہوئے
ملی تھی حق سے وہ طاقت انھیں خدا کی پناہ
خبر وفات کی سن کر کہا یہ عارف نے
پچھاڑا موت نے تو رستم زمان کو واہ

۱۹۶۰ ع

مولوی عبدالحق
کی
اردو لغت اور ریاست حیدرآباد

سال سنہ ۱۹۹۰ء کا یادگار تحفہ جناب ڈاکٹر سید داؤد اشرف صاحب ریسرچ آفیسر آندھرا پردیش آرکائیوز کی اپنی نوعیت کی منفرد تاریخی و تحقیقی بیش بہا تصنیف "بیرونی مشاہیر ادب اور حیدرآباد" کے عنوان سے زیور طبع سے مزین ہوئی تھی۔ اس معرکتہ الآراء تصنیف میں ڈاکٹر صاحب نے چند بیرونی علماء اور مشاہیر ادب کو ان کے علمی و تحقیقی پراجکٹ کی تکمیل کے لیے حضور نظام نواب میر عثمان علی خان آصف سابع نے جو فیاضانہ مالی امداد دی نیز ان کی ذات کے لیے تاحیات جو گرانقدر، وظائف عطا فرمائے ان کی تفصیلی روداد آرکائیوز کے ذخیرہ میں محفوظ ریکارڈ کی مدد سے اپنے ت افزا تبصرہ کے ساتھ بڑے ترتیب اور سلیقہ سے پیش کیا۔

پڑھ کر جہاں حضور نظام خسرو دکن آصف سابع کی شاہانہ علم پروری فیاضانہ داد و دہش سے متاثر ہونا ایک لازمی امر ہے وہاں یہ عجب خیز تاثر بھی پیدا ہوتا ہے کہ حضور نظام کی بے دریغ و بے مثال مالی اد سے متمتع ہونے والے ذی مرتبت علماء و مشاہیر نے نہایت سرسری از میں اس کا ذکر کیا اور بڑا تعجب یہ دیکھ کر ہوتا ہے کہ ان کے مداح قابل سوانح نگاروں نے ان عطایائے سلطانی اور ریاست حیدرآباد کی عدیم النظیر قدر دانی علم و فن کا تذکرہ کرنا بھی گناہ کبیرہ سمجھا۔ ایک ایسے موقع پر جب کہ ابھی حال میں ۲۸ دسمبر ۱۹۹۱ء کو دلی میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کی ادبی و لسانی خدمات پر ایک عظیم الشان چار روزہ بین الاقوامی

سیمینار ہوا اور اقطائے ہندو پاک کے علاوہ دوسرے ملکوں سے اہل علم و دانش اس سیمینار میں شریک ہوکر بابائے اردو اور ان کے خدمات جلیلہ کو خراج تحسین پیش کیا، جناب ڈاکٹر سید داؤد اشرف صاحب نے مولوی عبدالحق کے تعلق سے ایک چونکا دینے والا انکشاف اپنے مضمون بعنوان "مولوی عبدالحق کی اردو لغت اور ریاست حیدرآباد" دکن کے موقر روزنامہ سیاست کی اشاعت مورخہ ۳۰ ڈسمبر ۱۹۹۱ء میں کیا۔ اس مضمون میں یہ راوی کی متضاد بیانی ہے نہ دماغی اختراع کی جدت اور نہ کوئی خود ساختہ افسانہ طرازی بلکہ اس کا ماخذ آرکایوز کی وہ فائیل ہے جس میں مولوی عبدالحق کی درخواست اردو لغت کی تیاری کی تکمیل کے لیے ریاست حیدرآباد کی گران قدر مالی امداد اور حضور نظام کی شاہانہ سرپرستی کی مصدقہ روداد درج ہے۔ فائیل کی روداد سے یہ واضح ہے کہ مولوی عبدالحق کی درخواست پر حکومت حیدرآباد نے لغت کی تیاری و تدوین کے لیے ماہانہ ایک ہزار روپیہ دس سال کی مدت تک منظور کیا۔ مزید برآں مولوی صاحب کے حسب استدعا اڑھائی سو مشاہرہ پر ایک سال کی مدت کے واسطے کی منظوری دی۔ لغت کی طباعت کے لیے ایک قیمتی مانوٹائپ مشین خرید گیا۔ مولوی صاحب کی سفارشات حکومت نے اس شرط پر منظور کیں کہ لغت حکومت کی ملکیت ہوگی اور اس کے جملہ حقوق بحق جامعہ عثمانیہ محفوظ رہیں گے برسوں اس لغت کی تیاری کا کام چلتا رہا لیکن معلوم نہیں کیوں حکومت کی بار بار توجہ دہانی پر مولوی صاحب نے مرحلہ بہ مرحلہ تکمیل ہونے والے کام کو سرکار میں داخل نہیں کیا اور پھر یہ بھی ایک معمہ ہے کہ باوجود بار بار مسودہ طلب کرنے پر اسے حکومت کے حوالے کرنے کی بجائے نہ صرف اپنے پاس رکھا بلکہ بغیر اجازت اپنے ساتھ دلی لے گئے۔ یہ طریقۂ کار مولوی صاحب اور حکومت کے مابین شرائط کے منافی تھا۔ اس راز سربستہ کا انکشاف اس وقت ہوا جب مولوی صاحب پاکستان منتقل ہوگئے اور انجمن ترقی اردو کی سالانہ رپورٹ ۵۴۔۱۹۵۵ء

مشاعرہ عرس حضرت فیضؔ
کی
غزلیات کا پہلا مجموعہ

دکن کی سرزمین نے جن مقدس اور باکمال ہستیوں کو جنم دیا۔ ان میں حضرت فیضؔ کی ذات گرامی اپنا ایک خاص امتیازی مقام رکھتی ہے۔ نام آپ کا میر شمس الدین محمد اور تخلص فیضؔ تھا۔ آصف جاہ ثانی غفران مآب نواب میر نظام علیخاں کے عہد میں بمقام برار ۱۱۹۵ھ میں پیدا ہوئے۔ اس وقت برار قلمرو آصفیہ میں شامل تھا۔ اس لیے فرماتے ہیں:

شعرائے ہند کے سب فیض جنھیں کہتے ہیں
حیدرآباد دکن خاص وطن ہے ان کا

تین سال کی عمر تھی جب آپ برار سے اپنے والد میر امیر الدین صاحب کے ساتھ شہر حیدرآباد آئے اور یہیں تعلیم و تربیت کے مراحل طے ہوئے۔ جب نواب میر نظام علی خاں کا انتقال ہوا تو اس وقت آپ کی عمر تئیس سال تھی۔ مغفرت منزل نواب سکندر جاہ غفران منزل نواب ناصر الدولہ اور مغفرت مکان نواب افضل الدولہ کے دورِ حکومت میں حضرت فیضؔ بقیدِ حیات تھے۔ اور چھٹے بادشاہ غفران مکاں نواب میر محبوب علی خان کی پیدائش (۵ ربیع الآخر ۱۲۸۳ھ) کے دو ماہ بعد اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ تمام تذکرہ نگاروں نے بہت تعریف اور احترام سے آپ کا ذکر کیا ہے۔ اور آپ کو کثیر التصانیف بتایا ہے۔ لیکن آپ کی چند کتابیں مطبوعہ ہیں اور باقی غیر مطبوعہ۔ اردو کلام کے علاوہ دیوان "گلدستۂ عرفان" اور "دیوان فیض" (جس میں فارسی کلام بھی ہے) مطبوعہ موجود ہیں۔ بحیثیت شاعر جملہ اصنافِ سخن میں یدطولیٰ رکھتے تھے۔

دکن کے بادشاہوں کی شاہانہ سرپرستیوں اور امرا کی قدردانیوں کے سبب کئی بیرونی شعراء شاہ نصیر دہلوی شیخ حفیظ دہلوی اور مشتاق میرٹھی وغیرہ دکن آچکے تھے اور متوسلین میں شامل تھے۔ ان کے علاوہ مقامی شعراء ایمان قیس۔ تجلی اور آگاہ و حیدر جیسے استادانِ سخن کی سخن طرازی سے شعر و سخن کی محفلیں گرم رہتی تھیں۔ ان محفلوں میں جواں سال فیض نے بہت جلد اپنی سخن سنجیوں کی بدولت محفلِ شعرا میں جگہ بنالی اور کاملینِ فن سے خراجِ تحسین پایا۔

بلند مرتبہ شاعر ہونے کے علاوہ حضرت فیض علوم ظاہری و باطنی میں اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔ آپ ایک صوفی کامل اہل اللہ تھے۔ مشرب صلح کل رکھتے تھے۔ آپ کا کمالِ فن یہی ہے کہ اپنے مشاہدات اور وارداتِ قلبی شاعرانہ خوبیوں کے ساتھ کچھ اس طرح اشعار میں سموئے ہیں کہ شراب معرفت دو آتشہ ہوگئی۔ بے شمار مرید اور لاتعداد شاگرد و معتقدین بلا لحاظ مذہب ہندو مسلمان آپ سے وابستہ تھے جن میں امیر بھی تھے اور فقیر بھی جو آپ کو نہ صرف اُستاد بلکہ روحانی پیشوا اور پیر طریقت جانتے تھے۔ نظم ہو یا نثر جہاں کہیں بھی اپنے اُستاد حضرت فیض کا ذکر کیا ہے کچھ ایسی والہانہ عقیدت مندی سے کیا ہے کہ اس کی مثال دُنیائے شاعری میں نہیں ملتی۔

حضرت فیض کا انتقال ۱۴ رجب سنہ ۱۲۸۳ھ حیدر آباد میں ہوا۔ آپ کا مزار آج بھی بیرون لال دروازہ مرجع خلائق ہے ۱۴ رجب سنہ ۱۲۸۴ھ آپ کا پہلا عرس ہوا اور مزار حضرت فیض پر مشاعرہ کا اہتمام بھی۔ حضرت فیض کے عقیدت مند شاگرد محمد فیاض الدین خاں فیاض [المخاطب نواب مشرف جنگ] نے پہلا عرس اور مشاعرہ کرکے اپنے استاد کو نذرِ عقیدت پیش کی اور پھر اس کے بعد ہر سال نہایت اعلیٰ پیمانہ پر عرس اور مشاعرہ کا انتظام پابندی اور مستعدی سے کرتے رہے۔ مشاعرہ کی غزلیات "گلدستہ فیض" کے عنوان سے بڑے آب و تاب سے طبع ہوتے تھے اور جناب فیاض یہ گلدستہ عرس کے موقع پر بعد تناولِ طعام [برائے خاص و عام] شعراء کی نذر کرتے تھے۔ چنانچہ

تفضل حسین تفضل کہتے ہیں

تورمہ روٹی ملی اور ملا گلدستہ
ہم نے فیاضؔ کا احسان یہ احسان دیکھا

جناب فیاضؔ وضع داری سے پنتالیس ۴۵ سال تک عرس ومشاعرہ کا اہتمام کرکے اپنے استاد حضرت فیضؔ کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ جب ان کا انتقال سنہ ۱۳۲۸ھ ہوگیا تو ان کے فرزند نواب عزیز یار جنگ عزیزؔ نے اپنے والد مرحوم کی یادگار اور ان کے نام کو قائم رکھنے کے لیے اس نامی گرامی مشاعرہ کو مزید پانچ سال تک جاری رکھا اور گلدستہ فیض بھی مثل سابق نہایت عمدہ طور سے چھپ کر نظر افروز خلائق ہوتا رہا۔ جناب ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ اپنی تالیف "فیضِ سخن" میں حضرت فیضؔ کے اعراس اور مشاعروں کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے "قریب قریب پچاس سال تک یہ عرس اور اس کے مشاعرے حیدرآباد کی علمی و ادبی دنیا کا مرکز بنے رہے"۔ (۳۸)

مشاعرہ عرس حضرت فیضؔ کی غزلیات کا پہلا مجموعہ اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہے۔ سفید کاغذ کا سرورق چوطرف سے پھولوں کی بیل کے حاشیے سے مزین ہے۔ اوپر پہلی سطر جلی حروف میں خدا کی حمد و ثنا ہے۔

"ثنائے خدائے سخن آفرین وسپاس خالق مضامین رنگین"

اس توصیف کے بعد درمیان میں ایک مربع میں عنوانِ کتاب ہے "غزلہائے مشاعرہ عرس حضرت فیضؔ" مربع کے اطراف آٹھ اشعار کا قطعۂ تاریخ وفات حضرت فیضؔ ہے۔ جو آپ کے شاگرد حکیم محمد مظفر الدین خاں مزاجؔ کا فرمودہ ہے۔ مادۂ تاریخ یہ ہے۔

از سر آہی بگفتا رحلت شور کن
۱۲۸۳ھ

تاریخ وفات کے بعد دونوں کے نیچے ایک سطر میں مرتب کنندگان مجموعہ کے نام نظر آتے ہیں۔

"حسبِ فرمائش ناظم شریعت بیان محمد فیاض الدین خان صاحب تخلص فیاض و جناب میرا حمد علی صاحب تخلص عصری"

پھر دو لکیروں کے نیچے سرورق کی آخری سطر یہ ہے :-

"در مطبع کارنامہ لکھنؤ باہتمام محمد یعقوب مزین بہ طبع شد"

سرورق دیکھنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اس پہلے مشاعرے کا انعقاد اور غزلیات مشاعرہ کی کتابی شکل میں ترتیب و صورت گری شاگردانِ فیض جناب فیاض اور جناب عصری کی کوشش اور دلچسپی کا رہین منت ہے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ متذکرہ مجموعہ غزلیات حیدرآباد میں نہیں بلکہ لکھنؤ کے مطبع "کارنامہ لکھنؤ" میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوا۔

سرورق کی پشت پر حاشیہ ہے اور پیشانی کا غذ پر "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کے حروف جلوہ گر ہیں۔ بعد ازاں نو سطروں میں فارسی تحریر ہے اور اس تحریر کے پورے پانچ سطروں میں حضرت فیض کے نام سے پہلے صرف تعریفی القاب لکھے ہیں۔ پھر یہ بتایا گیا ہے کہ ۱۴ ارجب المرجب ۱۲۸۴ھ روز دوشنبہ بہ تقریب عرس محفلِ مشاعرۂ طرحی علامہ دوراں سلطان الشاعرین جناب حافظ شمس الدین محمد فیض قدس سرہ العزیز کے مزار پُر انوار پر منعقد ہوا تھا اور مجموعہ سخنوراں اعجاز بیان کے نتائج افکار کا آئینہ دار ہے۔ مزید یہ صراحت کی گئی ہے کہ "ہر قدر پرچہ ہا کہ دست یاب گشتند درج این اوراق پریشان شدند" اس بیان سے واضح ہے کہ حضرت فیض کے انتقال (۱۲۸۳ھ) کے بعد ہی دوسرے سال ۱۴ ارجب ۱۲۸۴ھ عرس اور مشاعرہ طرحی حضرت کے مزار واقع لال دروازہ منعقد ہوا۔ مجموعہ غزلیات اٹھائیس صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں ۲۸ شعرا کا کلام درج ہے۔ جن میں زیادہ تر شاگردانِ فیض ہی ہیں لیکن "ہر قدر پرچہ ہا دست یاب گشتند" سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ اس مشاعرہ میں دیگر شعرا نے بھی اپنا کلام سنایا تھا اور جن کی غزلیں دستیاب نہ ہونے سے محرومِ اشاعت ہو گئیں۔

اس کتاب میں شعرا کی اردو اور فارسی غزلیں موجود ہیں لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس مشاعرہ کا طرح مصرع کیا تھا۔ مندرجہ غزلیں دیکھنے سے قیاس ہوتا ہے کہ طبع آزمائی کے لیے تین طرحیں دی گئیں تھیں۔ قافیہ ردیف اس طرح ہیں:

۱: فیضانِ فیض ـــــ دیوانِ فیض

۲: بیان جناب فیض ـــــ شانِ جنابِ فیض

۳: در فیض صاحب کا ـــــ جوہر فیض صاحب کا

نمبر ایک اور دو طرحوں میں اردو اور فارسی شعراء نے سخن طرازی کی ہے اور نمبر تین میں صرف اردو میں غزلیں ملتی ہیں۔

ہر شاعر کا نام تخلص دو لکیروں کے درمیان درج ہے۔ اور جو غزلیں مندرج ہیں وہ شاعر کے تخلص کے سرِ حرف سے ردیف وار نہیں ہیں جیسا کہ گلدستوں کی اشاعت کا قاعدہ ہے۔ سب سے پہلے احتراماً حضرت فیض کے چھوٹے فرزند میر حیات الدین صاف [عرف اچھے میاں] کی غزل سے آغاز ہوا ہے۔ اس غزل کی بحر ساری غزلوں سے الگ ہے۔ اس مجموعۂ غزلیات کی آخری غزل استادِ سخن محمد حفیظ الدین یاسؔ کی ہے۔

ایک خصوصی جدت طرازی اس مجموعے کی یہ ہے کہ ہر شاعر کے نام سے پہلے شاندار خطاب لکھے گئے ہیں جیسے ریختۂ خامہ، شاعر جادو بیاں، شاعر کوہ وقار، سخنور بلند فکر، آبروئے فکر دُر دریائے نظم و نثر وغیرہ وغیرہ۔

حضرت فیض جیسے صوفی رازدار رموز خفی و جلی و پیر طریقت اور عدیم النظیر ادیب و شاعر باکمال کے انتقال کے ایک سال بعد ہی عرس اور مشاعرے کا انعقاد عمل میں آیا تھا۔ تمام شاگردانِ فیض، مرید اور عقیدت مند اس وقت بقید حیات تھے جو اس چشمۂ فیض سے فیض یاب ہوئے تھے ایسی قدسی صفات اور تقدس مآب شخصیت کی جُدائی کا غم دلوں میں تازہ تھا جس کو جُدا ہوئے صرف ایک سال گزرا تھا۔ تمام غزلیں پڑھیئے تو معلوم ہوتا ہے کہ

غزلیں کا ہے کو ہیں اپنے استاد حضرتِ فیضؔ کی جدائی کے غم میں مرثیہ خوانی ہے
اور کمال فن کا عقیدت مندانہ اظہار ہے۔

ایک نقطہ کا نہیں ہے فرق اس میں لاکلام
حرف استادوں پہ رکھ دیتے ہیں شاگردانِ فیض
[میر حیات الدین صاف]

تاسف شاعروں کو سر بہ سر ہے فیض صاحب کا
جسے دیکھا جہاں میں نوحہ گر ہے فیض صاحب کا
[راج بھوج رائے عرف بھولا ناتھ عیشؔ]

منوّر ہو گیا یمن قدم سے سارا گورستان
چراغِ لحد روشن اس قدر ہے فیض صاحب کا
[راج بھوج رائے عرف بھولا ناتھ عیشؔ]

یہ دل کعبہ ہے یا بت خانہ ہے یا بیت المقدس ہے
غرض جو کچھ ہے اے فیاض ہے گھر فیض صاحب کا
(محمد فیاض الدین خاں فیاضؔ)

شان کمال او ز حد توصیف برتر است
این وصف نیست لائق شانِ جناب فیض
باقی بیا بہ مرقد پاکش پے درود
کاین است در زمانہ نشانِ جناب فیض
[گردہاری پرشاد عرف بنی راجہ باقیؔ]

دانائے راز، عارف حق، پیر کاملے
شانِ خدا است رتبہ شانِ جناب فیض
[حفیظ الدین پاسؔ]

صفحہ آخر پر مجد وجیہ الدین علی خاں معنیؔ (شاگرد فیضؔ) کی رباعی صنعتِ مستزاد میں حضرت فیضؔ کی مدح میں ہے۔ اس رباعی کے بعد آخر میں مطبع

کارنامہ لکھنؤ کے مالک محمد یعقوب کا اردو میں آٹھ سطری نوٹ ہے کہ مجموعۂ کلام بلاغت نظام شعرائے دکن کو محمد فیاض الدین خاں صاحب دام ظلہٗ نے بہر تفریح طبائع شائقان مطبع کارنامہ لکھنؤ میں طبع کرایا۔ جو آغاز جمادی الاولیٰ ۱۲۸۵ھ میں طبع سے آراستہ ہوا۔

آخر میں عرض کرنا ہے کہ حضرت فیض کے پہلے عرس کے مشاعرہ کی غزلیات کا یہ مختصر سا مجموعہ نایاب اور کمیاب ہے۔ اگرچہ اس مشاعرہ کو منعقد ہوئے ایک سو بائیس سال ہو چکے ہیں۔ لیکن یہ مجموعہ دکن کی شعری وادبی سرگرمیوں کی مستند دستاویز اور اہل دکن کے ذوقِ سخن اور ان کی تہذیب وشائستگی کی یادگار تصویر ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جو شمع سخن ایک سو بائیس سال پہلے مزار فیض پر روشن ہوئی تھی۔ اس کی لو آج بھی تابندہ و فروزاں ہے۔

حبیب اللہ ذکا کی اُردو ہجو

اعلیٰ حضرت غفران مکان نواب میر محبوب علی خان کے استاد نواب سرور جنگ کی سوانح عمری "کارنامہ سروری" پڑھ رہا تھا۔ کتاب میں ایک جگہ نواب سالار جنگ مختار الملک مدار المہام حکومت آصفیہ کے اوقات کار کا ذکر کرتے ہوئے نواب سرور جنگ مرحوم نے لکھا ہے:

"بالخصوص صبح کے وقت دستار بر سر کمر بستہ چند حاضر باش مثل سید سعد الدین دہلوی شیخ احمد، داروغہ عبدالوہاب اور ان سب سے زیادہ استاد رضا علی بجائے اس کے کہ عیب وشکایت کریں ہنسی مذاق کے چند مہذبانہ حرف وحکایت سے وزارت پناہ کے جفاکش دل ودماغ کو خوش اور بشاش کرنے رہ ر خود نواب صاحب ایسے وقت کو غنیمت سمجھ کر ان کے ہنسی مذاق میں حصہ لیتے۔ سید سعد الدین کی نسبت ان

کے ایک ہم وطن مدراسی شاعر نے ایک ہجو بھی منظوم کی تھی ان کا ایک شعر مجھ کو یاد رہ گیا:

کاطیدن دلو چیدن دبر آنگ پڑ بدن
کُتّا ز تو بلی ز تو بندر ز تو آموخت

نواب سرور جنگ نے متذکرہ تحریر کے آخری جملے کچھ ایسے مبہم انداز میں لکھے ہیں کہ پڑھنے والے کے لیے سید سعد الدین، مدراسی شاعر اور اس کی ہجو کا ذکر ایک پہیلی سے کم نہیں۔ لیکن میں نے جب یہ پڑھا تو میرا ذہن فوراً اپنے جدِ امجد نواب مشرف جنگ فیاض کی ایک قدیم بیاض کی طرف منتقل ہوا جس میں سید سعد الدین کی شان میں اسی مدراسی شاعر کی اردو میں ہجو اور چند ہجو یہ رباعیاں موجود ہیں۔

سب سے پہلے مجھے یہ بتانا ہے کہ سیّد سعد الدین عرف چندا صاحب حیدر آباد کے قدیم امراء کے خاندان سے تھے۔ ان کے والد سیّد نظام الدین کو نواب سر سالار جنگ کے دربار میں بڑی رسائی اور تقرب حاصل تھا سیّد سعد الدین تعلقداری کے عہدہ پر فائز رہنے کے بعد معتمد صرف خاص و پیشی مبارک کی حیثیت سے کارگزار رہے۔ سیّد سعد الدین کے بعد ان کے اکلوتے فرزند سید عبدالرزاق المخاطب نواب آصف نواز الملک بہادر اس عہدۂ جلیلہ پر تا حیات متمکن تھے۔ سیّد سعد الدین کو بھی نواب سالار جنگ کے دربار میں رسائی تھی اور صاحب مغفور کے چند خاص درباریوں میں شامل تھے جیسا کہ نواب سرور جنگ نے بتایا۔

مدراسی شاعر جس کا نام نواب سرور جنگ نے نہیں بتایا وہ کوئی گمنام شاعر نہیں منشی حبیب اللہ ذکا کو کون نہیں جانتا۔ وہ نیلور (مدراس) میں سنہ ۱۲۴۴ھ میں پیدا ہوئے بعمر جوانی سنہ ۱۲۷۲ھ بامید قدردانی حیدر آباد آئے اور سنہ ۱۲۹۱ھ بعمر سینتالیس سال حیدر آباد میں اس دارِ فانی سے کوچ کیا حیدر آباد آنے کے بعد پہلے نواب سالار جنگ کے

محکمہ "دار الانشا" میں ملازم ہوئے اور آخری زمانے میں نواب مغفور کی نوازش سے تعلقداری کی خدمت سے سرفراز ہوئے۔ نواب مغفور کی جوہر شناسی اور قدر دانی کی بدولت ان کے دربار میں بے تکلفانہ رسائی رکھتے تھے۔ ذکا فارسی کے بے عدیل شاعر اور بے مثل ادیب تھے۔ حیدر آباد آئے تو استاد کُل حضرت فیضؒ کے شاگرد ہوئے اور استفادہ کیا اور پھر اپنے فارسی اردو کلام پر غالب سے اصلاح لی۔ غالب جیسا ہمہ دان اِن کا مداح ہے۔ ذکا کے مجموعہ نظم و نثر "خاش و خماش" پر غالب نے تقریظ لکھ کر ان کے علم و فضل سخن دانی اور سخن گوئی کا اعتراف کیا ہے۔ وہ اردو غزل بھی کہتے تھے لیکن اردو کلام ان کی فارسی شاعری کے رُتبہ کو نہیں پہنچا۔ البتہ قصائد اور ہجویات سے ذہانت، جدت طرازی اور اعلیٰ خیالی کے جوہر چمکتے ہیں۔ ظرافت اور بذلہ سنجی طبیعت ثانیہ تھی خاص کر ہجو کہنے میں طبع جدت پسند رکھتے تھے اس فن میں انھیں ثانی سودا کہیں تو بجا ہے۔

منشی حبیب اللہ ذکا اور نواب مشرف جنگ بہادر [محمد فیاض الدین خان فیاض] نے حضرت شمس الدین فیضؔ کے آگے زانوے تلمذ تہ کیا تھا اور کلام پر اصلاح لی۔ اپنے غیر مطبوعہ لغت "خزینۃ الامثال" کے دیباچہ میں حضرت فیضؒ نے اپنے ان دونوں شاگردوں کے نام لکھے ہیں۔ کچھ اس وجہ سے کہ ذکا اور فیاض میں مراسم دوستی قائم تھے اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ فیاضؔ سید سعد الدین تعلقدار کے حقیقی ہم زلف تھے یہ ہجوئیں بصیغۂ راز بیاض میں درج ہیں کہتے ہیں کہ سید سعد الدین صاحب کی طبیعت میں غصہ بہت تھا بھلا ذکا جیسا ہجو گو شاعر یہ کہاں برداشت کر سکتا تھا کئی ہجوئیں فارسی اور اردو میں سید سعد الدین کی شان میں لکھ ڈالیں۔ پھر بھی اسی ہجو کا مقصد ذاتی عداوت نہیں بلکہ تفنن طبع اور خوش طبعی ان کے محرک ہیں اور سب سے بڑھ کر ایسی ہجو کا مقصد جیساکہ نواب سرور جنگ بہادر نے بتایا وزارت پناہ نواب سر سالار جنگ کے جفاکش دل و دماغ کو خوش کرنا تھا۔

ذکا کے مجموعہ نظم و نثر "خاشِ و خماشِ" میں چند فارسی ہجویں ضرور ملتی ہیں اردو ہجویں ناپید ہو چکی ہیں۔ بیاض سے ان کی غیر مطبوعہ ہجو اور رباعیات ملی ہیں۔ یہ اردو کلام بھی بہت نایاب اور یادگار ہے اور غیر مطبوعہ ہے:

کل میں بیٹھا تھا گھر میں اے ہمراز
اس میں آکر کسی نے دی آواز

جو ہیں میں آ کے دیکھتا ہوں کیا
آشنا ہے قدیم ہے اپنا

بیٹھا دیوان خانے میں جا کر
کی مدارت حقّہ منگوا کر

ذکر نکلا اِدھر اُدھر کا تمام
لگے آپس میں ہونے کلم و کلام

پوچھا اچھا تو ہے مزاج شریف
بعد مدت اِدھر کئے تکلیف

نہیں ملنے کا جب گِلا آیا
اس طرح تب انھوں نے فرمایا

تنگ لائی ہے مجھکو بیکاری
یہی اب تو بڑی ہے بیماری

کیا کروں نفس شوم غالب ہے
ہر طرح فکر قوت واجب ہے

ورنہ بڑھ کر ہے اس سے بات کوئی
دوستوں کی ملازمت سے بھی

رات دن جستجو میں گزرے ہے
بس اسی گفت گو میں گزرے ہے

خالی الذہن میں نے تب یہ کہا
لے کے چلتے ہیں آپ کو اک جا

ایک مشفق ہیں میرے سعد الدین
اپنے پاس آپ کو رکھیں گے یقین

آج کل ہیں بڑے تعلقدار
اور سرکار میں بھی ہیں مختار

بات اول کی تو بہت ہے دُور
ان کو فی الجملہ اب تو ہے مقدور

خوب سوجھی ہے ٹھیک بات ہے ہاں
آپ اچھی طرح رہیں گے وہاں

الغرض میں یہ ذکر جب لایا
قہقہہ مار انھوں نے فرمایا

وہی نا ان کو میں نے پہچانا
چندا صاحب بھی عرف ہے جن کا

اک وہ مشہور ہے زمانے میں
اک وہ مغرور ہے زمانے میں

ایک کنجوس ہے وہ ناہموار
ایک منحوس ہے وہ بد کردار

ایک بد ذات ایسا تیسا ہے
جانتا ہوں میں اس کو جیسا ہے

کیا کروں میں صفت اس احمق کی
صاف صورت ہے بس ہیولی سی

دیکھنے کے ہے قابل اس کی چال
کہتے ہیں لوگ اسے خرد جال

مجھ کو بالفرض لے بھی آپ گئے
ہے یقین بات وہ کسی کی سنے

باپ کو جو نہ بولے باپ اپنا
کب پڑوسی کو وہ کہے گا چچا

جس کی صورت سے لوگ ڈرتے ہیں
آپ وہاں مجھ کو لے کے چلتے ہیں

یہ تو ارشاد سعدی شیراز
پیش ازیں کر گئے ہیں بندہ نواز

کس نہ آید بزیر سایۂ بوم
ور ہما از جہان شود معدوم

رُباعیٔ

(۱)
کیوں آپ کو کھچتا ہے تو دور اتنا
دو دن کی ہوا پہ ہو نہ مغرور اتنا
کیا کرتا خدا جانے تو جب سعدالدین
اللہ نے دیا نہ تجھ کو مقدور اتنا

(۲)
شیخی نہ بگھار میرے آگے مطلق
چندا صاحب کہوں گا میں بھی حق حق
مشہور کیا ہے خود کو دانا تو نے میں
دُنیا میں نہیں کوئی بھی تجھ سا احمق

(۳)
چندا صاحب ہے جس کو عالم کہتا
میں کیا کہوں اسکی خوبیاں ہیں کیا کیا
بدخو، بدعہد، بے مروت، بے دید
بے دین، بے مہر، بے وفا، بے پردا

(۴) اچھا نہیں چھوڑ سرکشی کا انداز
دو روز کی چاندنی پہ بے جا ہے ناز
مشہور ہے یہ مثل تو جی خدا صاحب
لاٹھی میں نہیں خدا کے ہوتی آواز

(۵) کچھ جھوٹ نہیں ہے بات اس میں سرمو
کیا سانچ کو آنچ کس کا ڈر ہے کس کو
بس نام ہے اک بڑا کہ جی خدا صاحب
صورت کو ملاحظہ کرو تو آخ تھو

اعلیٰ حضرت غفران مکان
نواب میر محبوب علیخان آصفؔ کی غزل پر خمسے

اعلیٰ حضرت غفران مکان نواب میر محبوب علیخان جس طرح تاجدارِ دکن تھے اقلیم سخن کے بھی بادشاہ تھے۔ آصفؔ تخلص فرماتے تھے۔ نواب مرزا خان داغؔ دہلوی استاد شہہ تھے۔ رجحان طبع غزل گوئی کی طرف مائل تھا مینائے غزل میں داغؔ کا رنگِ سخن جھلکتا ہے لیکن خود آپ کی شاعری کا ایک منفرد انداز بھی ہے جس میں شاہانہ وقار کی جلوہ آرائی نمایاں و صاف ہے :

رہیں گے ان سے کبھی ہم نہ دب کے اے آصفؔ
وہ شاہ حسن سہی شہریار ہم بھی ہیں
تم نے آصفؔ کا نام کیا رکھا
لوگ اس کو حضور کہتے ہیں

حضور کا کلام حیدرآباد دکن کے رسائل اور گلدستوں میں چھپتا تھا خاص طور سے مہاراجہ شادؔ کے جاری کردہ ماہ نامہ "محبوب الکلام" میں آپ کی غزل تصویر کے ساتھ پابندی سے زیب رسالہ ہوتی تھی۔ حیدرآباد

سے مشاعروں، رسائل میں اعلیٰ حضرت غفران مکان کی غزل کا مصرعہ بطور مصرعۂ طرح دیا جاتا تھا جس پر شعراء طبع آزمائی کرتے تھے۔ بعض دفعہ کسی شاعرہ کی "طرح" پر بھی حضور غزل فرماتے تھے۔

مہاراجہ شادؔ نے ایک دفعہ یہ جدت کی کہ مصرعہ طرح پر غزل کہنے کی بجائے حضور کی غزل پر خمسہ کہنے کی شعراء سے فرمائش کی۔ جس غزل کا انتخاب مہاراجہ شادؔ نے فرمایا اس کا مطلع اور مقطع حسبِ ذیل ہے:

سوال وصل پہ نیچی نظر تھی کیا ان کی
ہماری آنکھ میں پھرتی ہے وہ حیا ان کی

ملے تھے آج تو ہم بھی جناب آصفؔ سے
عجیب رنگ میں ہیں پوچھتے ہو کیا ان کی

مقامی اور بیرونی شعراء نے اس غزل پر جو خمسے کہے وہ "محبوب الکلام" میں شائع ہوئے۔ راقم الحروف نے جس محبوب الکلام کو دیکھا اس کا اول و آخر صفحہ نہیں ہے اس لیے معلوم نہیں ہوتا کہ کس ماہ اور سنہ کا ہے بہرحال اپنے اپنے مقطع میں شعراء نے جن عقیدت مندانہ جذبات کا اظہار کیا ہے اس سے ظاہر ہے کہ اعلیٰ حضرت غفران مکان نواب میر محبوب علیخان صرف نام کے محبوب نہ تھے بلکہ سچ مچ "محبوب الخلایق" تھے۔ مقطع پر چند خمسے پیش ہیں۔

[۱] مہاراجہ شادؔ

خزینہ ہائے پُر از زر ہمیں کروڑ ملے
خدا نے گوہر خوشی آب بے شمار دیئے
زہے نصیب کہ ہم شادؔ شاد ہوئے
ملے تھے آج تو ہم بھی جناب آصفؔ سے
عجیب رنگ میں ہیں پوچھتے ہو کیا ان کی

[۲] راجے بہاری لعل رمزؔ حیدرآبادی۔

دکن کے شاہ ہیں سرتاج ہیں دو عالم کے
ہیں ان کے فیض کے اب رتبہ چار سو چرچے
زیادہ اس سے بھی پایا جو تم سے سنتے تھے
ملے تھے آج تو ہم بھی ....
عجیب رنگ میں ہیں ....

[۳] محمد عبداللہ خاں ضیغم لکھنوی
وہ ساقیاں سمن بر کے جمگھٹے دیکھے
پری جمال ہزاروں تھے روبرو بیٹھے
خدا کی شان ہے ضیغم انھیں خدا رکھے
ملے تھے آج تو ہم بھی ....
عجیب رنگ میں ہیں ....

[۴] بادشاہ علی ضیا لکھنوی۔
جناب شاد نے رتبے یہ شاعروں کو دیئے
غزل کو شاہ کی خمسہ کیا ضیا سب نے
جسے سنو یہی فخریہ کرتا ہے دعوے
ملے تھے آج تو ہم بھی ....
عجیب رنگ میں ہیں ....

[۵] میر احمد علی عصر حیدرآبادی۔
طریقے یاد ہیں کیا خوب ملک رانی کے
ہر اک جواب تھا برجستہ برمحل فقرے
عقیل عصر نہ دیکھے کہیں نہ اِسے سنے
ملے تھے آج تو ہم بھی ....
عجیب رنگ میں ہیں ....

[۶] حبیب کنتوری لکھنوی۔

خدا گواہ یہ ماہوں ہیں زمانے کے
نظام ملک وملل آپ سے کوئی پوچھے
بڑے بڑوں کو سنا ہے جیب یہ کہتے
ملے تھے آج تو ہم بھی ۔ ۔ ۔ ۔
عجیب رنگ میں ہیں ۔ ۔ ۔ ۔

[۷] نواب عزیز یار جنگ عزیز ۔
عزیز اور صاحب تھے ہاتھ باندھے کھڑے
جب ان کے آگے پڑھے شاعروں نے یہ نغمے
سخن کی داد وہ دینے تھے لے رہے تھے مزے
ملے تھے آج تو ہم بھی ۔ ۔ ۔ ۔
عجیب رنگ میں ہیں ۔ ۔ ۔ ۔

مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ کا خط

نواب عزیز یار جنگ عزیزؔ کے نام

بعض خط ایسے ہوتے ہیں جن کا مفہوم اور اشارات صرف اس خط کے لکھنے والے [کاتب] اور مخاطب پڑھنے والے (مکتوب الیہ) کو ہی معلوم رہتے ہیں۔ عام لوگوں کے لیے اس پیچ دار گفتگو کا سمجھنا پہیلی بوجھنے سے کم نہیں ہوتا۔ مہاراجہ بہادر کا یہ خط کچھ اسی انداز کا ہے۔ راقم الحروف تھوڑی بہت واقفیت خط کے مفہوم سربستہ سے رکھتا ہے۔ اس لیے اظہارِ خیال کی جرأت کی ہے۔

مہاراجہ بہادر نے یہ خط نواب عزیز یار جنگ عزیزؔ کو لکھا ہے۔ نواب عزیز یار جنگ نواب مشرف جنگ فیاض مددگار معتمد صرف خاص کے فرزندِ اکبر اور جناب سید عبدالرزاق المخاطب، آصف نواز الملک معتمد

صرفِ خاص کے داماد تھے۔ طبقہ امراء میں شمار ہونے کے علاوہ ناظم عدالت ضلع اطرافِ بلدہ کی حیثیت سے ایک قابل جرأت مند اور نامور عہدہ دار ہوئے ہیں۔ وہ استاد داغ کے فیض یافتہ ایک خوش فکر شاعر و شاگرد اور مکتبِ داغ کے قادر الکلام استادِ سخن بھی تھے۔ دربار شاد میں نواب عزیز یار جنگ کی بڑی رسائی اور عزت تھی۔ مہاراجہ بہادر سے روابط مخلصانہ رکھتے تھے۔ مہاراجہ کے دَور میں جب شاد کلب قائم ہوا تو نواب عزیز کلب کے آنریری سکریٹری کی حیثیت سے سرگرم عمل رہے۔ مہاراجہ سے خلوص اور عقیدت کو آخر وقت تک نبھایا۔ مہاراجہ کے انتقال (سنہ ۱۹۴۰ء) کے بعد بھی بزم شاد کے مشاعروں میں باوجود ضعیفی میں نے خود نواب عزیز یار جنگ کو شرکت کرتے اور حصہ لیتے دیکھا ہے۔

جس مشاعرہ کا خط میں ذکر ہے وہ عرس حضرت فیض کا مشاعرہ ہے۔ نواب مشرف جنگ فیاض اپنے استاد حضرت شمس الدین محمد فیض کے انتقال (سنہ ۱۲۸۳ھ) کے بعد سے ہر سال ۱۴ رجب کو عرس اور طرحی مشاعرہ کا اہتمام اور انتظام بڑی عقیدت مندی اور مستعدی سے مزار پرانوار حضرت فیض واقع بیرون لال دروازہ پر تقریباً (۴۵) سال تک کرتے رہے۔ طرحی (فارسی و اردو) غزلیات کا مجموعہ گلدستہ فیض کے نام سے شائع ہوتا تھا۔ جو شاعر مشاعرہ میں شرکت سے مجبور رہتے وہ ذریعہ ٹپہ جناب فیاض کو اپنی غزل بھجواتے تھے تاکہ شریکِ گلدستہ ہو۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد نواب عزیز نے مزید پانچ سال تک عرس حضرت فیض اور طرحی مشاعرہ کی روایت کو جاری اور قائم رکھا۔

حضرت فیض کے ان مشاعروں میں مقامی اور بیرونی اساتذۂ سخن اپنے شاگردوں کے ساتھ شریکِ بزم مشاعرہ ہوتے تھے۔ طبقہ امرا سے آصف یار الملک وزیر، مہاراجہ کشن پرشاد شاد، راجہ گردھاری پرشاد عرف بنسی راجہ باقی، صولت جنگ عابد، عظام الدولہ دارا، اقبال یار جنگ اقبال، لقمان الدولہ دل اور صادق جنگ عالم وغیرہ ان مشاعروں میں شریک ہو کر

غزل سنانے کو اپنی سعادت سمجھتے تھے۔ ایک مشاعرہ میں مہاراجہ شاد نے اپنی غزل سے پہلے ایک رباعی سنائی تھی ؎

آصف کا غلام خانہ زاد آیا ہے
ہاں فیض سے پانے کو مراد آیا ہے
اک دھوم مچی ہے انگلیاں اٹھتی ہیں
صحنِ میں مشاعرہ کی شاد آیا ہے

جس مشاعرہ کا خط میں مہاراجہ بہادر نے ذکر کیا ہے وہ عرس حضرت فیضیا کا ۱۴ رجب المرجب سنہ ۱۳۲۹ھ کا مشاعرہ ہے۔ جس کا اہتمام و انتظام نواب عزیز یار جنگ نے کیا تھا۔ اس مشاعرہ کی فارسی طرح تھی:

سوختن بر شمع مردہ کار ہر پروانہ نیست

اور اردو طرح :-

حضرت فیض کا ہر وقت کرم ہوتا ہے

مہاراجہ شاد نے فارسی طرح پر سات شعر اور اردو طرح میں گیارہ شعر فرمائے تھے۔ اردو کے چند شعر پیش ہیں۔

وہی ہوتا ہے جو قسمت میں رقم ہوتا ہے
نہ تو ہوتا ہے سوا اس سے نہ کم ہوتا ہے
ٹیس جب ہوتی ہے دل میں تو نکلتے ہیں اشک
یاد جب آتی تری مجھے غم ہوتا ہے
جس پر اے شاد ہوا کرتا ہے فضل خالق
پھر تو موجود وہیں جاہ و حشم ہوتا ہے

مہاراجہ شاد نے اپنی غزلیں روانہ کی تھیں شریک بزم مشاعرہ نہیں ہوئے خط سے واضح ہے کہ وہ منتظر رہے کہ حسب عادت نواب عزیز یار جنگ یا آصف یا ور الملک بلائیں تو مشاعرہ میں جائیں۔

خط کے ابتداء میں آصف یاور الملک کا نام آیا ہے۔ نواب صاحب کا

نام میر وزیر علی خاں ہے ۔ وہ خاندان آصفی سے تعلق رکھتے تھے ۔ نواب افضل الدولہ کی صاحب زادی سراج النساء بیگم صاحبہ آپ کی محل تھیں ۔ برقرار جنگ آصف یار الدولہ اور آصف یاور الملک کے خطابات غفران مکان نواب میر محبوب علی خاں نے عطا کئے تھے ۔ اقربائے سرکار ہونے کے علاوہ بڑے فقیر منش ، وضع دار اور رتبہ کے امیر تھے ۔ شعر و سخن کا ذوق تھا ۔ اور وزیر تخلص فرماتے تھے ۔ حضرت میر احمد علی عصر حیدر آبادی کے شاگرد تھے ۔ حضرت فیض کے مشاعروں میں ذوق و شوق اور عقیدت مندی سے حاضر ہوتے تھے ۔

خط میں مہاراجہ بہادر نے اپنے فرزند آصف پرشاد کی وفات کا ذکر کیا ہے اور ایک جلد " فریاد شاد " نواب عزیز یار جنگ کو بھیجتے ہوئے فرمایا کہ اِن کے فرزند کے غم کا مرثیہ ہے ۔ مہاراجہ کو مختلف بیویوں سے تیرہ لڑکیاں اور سات لڑکے پیدا ہو چکے تھے ۔ چار لڑکیوں کا انتقال ہو چکا تھا ۔ اس وقت نو زندہ تھیں ۔ البتہ سات لڑکے سال دو سال کی عمر پاکر یکے بعد دیگرے داغِ مفارقت دے چکے تھے ۔ اولاد نرینہ نہ ہونے سے مہاراجہ کو شدید غم اور دکھ ہوتا تھا ۔ مایوسی کا احساس ہوتا تو یہ کہہ کر اپنے آپ کو دلاسہ دیتے :

ہاتھ سے دامنِ امید نہ چھوٹے اے شاد
جس نے یہ داغ دیا ہے وہی مرہم دے گا

آخر اِن کی دعائے سحری کی قبولیت کا وقت آیا ۔ دوسری رانی کے بطن سے ۱۱ ر صفر سنہ ۱۳۲۸ ھ لڑکا پیدا ہوا ۔ اس لڑکے کا نام غفران مکان نے آصف پرشاد رکھ کر عزت افزائی فرمائی ۔ مہاراجہ کو اِس لڑکے کی پیدائش پر بڑی مسرت اور شادمانی ہوئی ۔ مہاراجہ کی تاریخ پیدائش (۱۲۸۰ ھ) کے حساب سے اس وقت اِن کی عمر (۴۸) سال تھی ۔ جب آصف پرشاد کی عمر ایک سال کی ہوئی تو وہ بیمار ہوئے ۔ گلے پھول گئے اور بخار آنے لگا ۔

اس وقت کے دستور حکمرانی اور مہاراجہ پر الطاف شاہانہ کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ خود غفران مکان محبوب علی پاشاہ نے مہاراجہ کی ڈیوڑھی آکر آصف پرشاد کی مزاج پرسی کی اور پھر اس وقت کے رزیڈنٹ سر چارلس بیلی نے بھی ایسا ہی کیا۔ تمام بڑے حکیموں اور ڈاکٹروں کا علاج ہوا۔ عورتوں کے کہنے سے عاملوں کو بھی دکھایا۔ درگاہوں پر حاضری دی۔ بزرگوں مجذوبوں اور مہنت و پنڈت کے پیروں پر اپنی پگڑی اُتار کر رکھی اور دُعاء کے طالب ہوئے۔ سبھوں نے بچہ کے جینے کی اُمید دلائی لیکن موت کا وقت ٹل نہ سکا اور آصف پرشاد کا ۱۲ / صفر ۱۳۲۹ھ انتقال ہو گیا۔ مہاراجہ نے اس موقع پر بڑی حسرت و یاس سے لکھا ہے "آصف پرشاد جن کی سالگرہ ہونے کی تاریخ تھی اس کی عمر کی آخری سال گرہ ہوگئی۔ اب کوئی گرہ نہ پڑے گی۔ ایک سال ہی میں عمر طبعی ختم ہوگئی"۔ مہاراجہ کو جب بتایا گیا کہ آصف پرشاد کی زندگی کا چراغ گُل ہو رہا ہے تو شدت غم سے اپنے نونہال کی صورت دیکھے بغیر سرکار کی اجازت لے کر اورنگ آباد روانہ ہوئے۔

"فریادِ شاد" مہاراجہ کے اسی فرزند کا مرثیہ ہے جو بطرز مثنوی لکھا گیا ہے۔ مہاراجہ اس شاہی دور میں پیشکار، وزیر فوج اور وزیر اعظم کے علاوہ بڑے وضعدار امیر بھی تھے۔ وہ مشرقی تہذیب و شائستگی کا بے مثال نمونہ تھے لیکن اولاد کا غم امیر و فقیر اور شاہ و گدا کے لیے فطرتاً یکساں ہے۔ "فریاد شاد" کے آئینہ میں مہاراجہ بہ چشم گریاں، چاک گریباں اور خاک بر سر نظر آتے ہیں۔

غم سے فرزند کے ہے دل ناشاد
کس سے تیرے سوا کروں فریاد
آرزوئیں جو تھیں ہوئیں برباد
ہوگیا شاد وفعتہً ناشاد
نہیں اب تاب غم کے سہنے کی
نہیں طاقت زبان سے کہنے کی

جی میں آتا ہے خوب سر پیٹوں
مار کر ڈھاریں خوب سا روؤں
جیب و داماں کو اپنے چاک کروں
خاک کو لے کے اپنے سر پہ ملوں
خودکشی کا خیال آتا ہے
غم کلیجہ کو کھائے جاتا ہے
نام اس کا وظیفہ میرا ہے
کیا ہوا دل کو حال یہ کیا ہے

خط پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے لیکن فریاد شاد سنہ ۱۳۲۹ھ کو طبع ہوئی. مشاعرہ اسی سال ۴ ارجب کو ہوا۔ اغلب یہی ہے کہ رجب کی آخری تاریخوں میں خط لکھا ہوگا۔ خط میں جن اشعار کو رشتہ دوز کرنے کا ذکر ہے وہ اشعار دستیاب نہیں۔

شاعری میں مہاراجہ شآد کے اُستاد

نواب مہدی نواز جنگ بہادر نے مہاراجہ بہادر شآد کی سوانح عمری بعنوان "مہاراجہ کشن پرشاد" سنہ ۱۹۵۰ء میں مرتب وشائع کی یہ تذکرہ بہت مُستند ہے کیوں کہ اسے ایسی شخصیت نے مرتب کیا جس کے مہاراجہ سے نجی کے اور سرکاری روابط بہت قریبی تھے۔ باب دوم صـ۲ـ میں مہاراجہ کے خود نوشتہ حالات کا اقتباس درج ہے۔ اپنے خود نوشتہ حالاتِ زندگی میں مہاراجہ شآد نے اپنے ان اساتذہ سخن کا ذکر کیا ہے جن سے انہوں نے اپنے فارسی اور اردو کلام پر اصلاح لی ہم نے اپنے مضمون کی تیاری میں اسی خود نوشتہ کو پیشِ نظر بنایا ہے۔

مہاراجہ شاد سنہ ۱۲۸۰ھ [بارہ سو اسی ہجری] میں فرخندہ بنیاد

حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ سنہ ۱۲۸۰ھ میں جب کہ ان کی عمر تیس (۳۰) سال تھی اپنی شاعری کی ابتداء کی۔ اول اول فارسی میں شعر کہنے لگے کیونکہ اس زمانہ میں فارسی زبان کا چلن زیادہ تھا۔ پھر اردو میں طبع آزمائی کر کے مشق سخن کو آگے بڑھایا۔

"رائے بچو لال تمکین" رائے بچو لال تمکین حیدر آبادی، استاد کل حضرت میر شمس الدین محمد فیض رح کے تربیت یافتہ شاگرد تھے۔ فارسی میں شعر کہتے تھے اور قادر الکلام استاد تھے۔ ان کے انتقال کے بعد راجہ گردھاری پرشاد باقی [عرف بنسی راجہ] نے سنہ ۱۳۰۲ھ [تیرہ سو دو ہجری] میں ان کا کلام مرتب کر کے "نگارستان تمکین" کے نام سے شائع فرمایا۔ تمکین بلند پایہ شاعر ہونے کے علاوہ ایک ماہر فن خطاط بھی تھے۔ مہاراجہ نے ان سے خطاطی بھی سیکھی تھی۔ مہاراجہ فرماتے ہیں:

"میں نے بچو لال تمکین سے جن کا ذکر قبل از این ہوا ہے اصلاح سخن کی بنیاد ڈالی۔ علاوہ فارسی کے اردو میں بھی ابتداء ان ہی سے کی۔"

عبد العلی والہ مہاراجہ کی اصلاح سخن کا سلسلہ زیادہ مدت تک قائم نہ رہ سکا کیوں کہ تھوڑے دنوں میں جناب تمکین کا انتقال ہوگیا استاد کے مرنے کا مہاراجہ کو کچھ ایسا صدمہ ہوا کہ انھوں نے کئی دنوں تک شعر گوئی ترک کردی۔ جب مدرسہ "عالیہ" میں بغرض تعلیم شریک ہوئے تو شاعری کی طرف مائل و متوجہ ہوئے اور اس وقت عبد العلی والہ سے مشورہ سخن کیا۔ عبد العلی والہ "مدرسہ عالیہ" میں عربی وفارسی کے استاد تھے۔ شاعری فارسی میں کرتے تھے ان کا دیوان "چمنستان بہشت" کے نام سے مطبوعہ موجود ہے۔ اپنے فارسی تذکرہ "سخنوران چشم دیدہ" میں جناب ترک علی شاہ ترکی نے والہ کے علم و فضل کے بارے میں لکھا ہے کہ "مردم ایران و ہندوستان آن مجمع صفات را سعدی دکن می گفتند"۔

[ص ۱۲۴]

مولانا مولوی نور الضیاء الدین ضیاء نام اور تخلص وہی ہے جو زیب عنوان ہے۔
نواب ضیاء یار جنگ بہادر خطاب۔ اورنگ آباد میں پیدا ہوئے اور اسی خاک پاک میں پیوند زمین بھی بمفتی مجلس عالیہ عدالت حکومت حیدرآباد تھے۔ جناب ضیاء فارسی کے عدیم النظیر استاد سخن تھے دکن کے قدیم رسائل میں ان کا کلام بلاغت نظام بکھرا پڑا ہے مگر افسوس کوئی قلمی یا مطبوعہ دیوان موجود نہیں۔ مہاراجہ جناب ضیاء کے بارے یوں کہتے ہیں:
"علم وفضل میں باکمال ہونے کے علاوہ شعر وسخن کا مذاق بھی اعلیٰ درجہ کا ہے۔ کبھی کبھی کوئی غزل یا رباعی لکھ لیتا ہوں تو مولانا نور الضیاء الدین المتخلص ضیاء کو دکھا لیا کرتا ہوں۔"

ترک علی شاہ ترکی ترک علی شاہ ترکی اعلیٰ حضرت غفران مکان نواب میر محبوب علیخان کے عہد میں پنجاب سے حیدرآباد آئے۔ ازراہ قدردانی سرکار سے ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر ہوا فارسی شاعری کے بلند مرتبہ استاد مانے جاتے تھے کبھی کبھی اردو میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ فن عروض میں مسلم مرتبہ رکھتے تھے۔ صاحبِ دیوان اور صاحبِ تصانیف تھے۔ ان کا فارسی تذکرہ سخنوران چشم دیدہ" دنیائے ادب میں اہم اور مستند دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ مہاراجہ لکھتے ہیں:
"جب کبھی مولوی صاحب [ضیاء یار جنگ] اپنی ضرورتوں کے لحاظ سے اورنگ آباد جاتے ہیں تو ترک علی شاہ المتخلص ترکی سے مشورہ کیا کرتا ہوں۔"

مولانا مظفر الدین معلیٰ مولانا مظفر الدین معلیٰ محمد آباد بیدر میں پیدا ہوئے اور شہر حیدرآباد میں آسودہ خواب ہیں۔ بحیثیت مددگار ناظم ثبت خانہ جات حکومت سرکار عالی کے عہدہ پر فائز رہ کر

اسّی سال کی عمر میں سنہ ۱۳۳۵ھ [تیرہ سو پینتیس ہجری] دنیا سے رخصت ہوئے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ فن شاعری میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ ان کا دیوان "ریاض معلیٰ" ان کے فرزند نے ان کے انتقال کے بعد سنہ ۱۳۴۰ھ [تیرہ سو چالیس ہجری] میں زیور طبع سے آراستہ کرایا۔ مہاراجہ رقم طراز ہیں:

"اردو میں محمد مظفرالدین صاحب جن کا تخلص معلیٰ ہے ان کو غزل دکھایا کرتا تھا" اپنے استاد کا تعارف مہاراجہ یوں کراتے ہیں:

تم معلّیٰ کو نہیں پہچانتے؟!
شاعری میں شادؔ کا استاد ہے

اعلیٰ حضرت غفران مکان نواب میر محبوب علی خان آصف

حضور غفران مکان کے آگے مہاراجہ شادؔ نے زانوئے تلمّذ تہ نہیں کیا جیسا کہ مرقع سخن جلد اول میں مہاراجہ پر لکھے گئے مضمون میں ذکر کیا گیا ہے واقعہ یہ ہے کہ مہاراجہ مشرقی تہذیب وشائستگی کی بولتی تصویر تھے آداب دربار داری کے رموز سے کما حقہ واقف تھے اس لیے جب غفران مکان نے ان کی غزل کے ایک شعر پر ایک لفظ کی اصلاح کی تو اس اصلاح کو اپنے لیے بادشاہ سے نسبت شاگردی کو صد ہزار جاہ و منصب جانا چنانچہ فرماتے ہیں:

"ایک شعر میں فاش غلطی تھی۔ اپنی خطا پوش نظر سے اس کی اصلاح فرمائی۔ میں نے قدم چومے اور سرفرازی کی نذر پیش کی اور متمنی ہوا کہ شادؔ [شادؔ تلمیذ آصف] لکھے جانے کی اجازت ملے سنہ ۱۳۱۶ھ (تیرہ سو سولہ ہجری) میں شاگردی کے خطاب سے سرفراز ہوا۔"

کس فخر و ناز سے کہتے ہیں:

گو شاعری سے مجھ کو سروکار ہی نہیں
پر فخر کیا یہ کم ہے کہ شاگردِ شاہ ہوں

نواب مرزا خان داغ دہلوی

استاد داغ کے شاعرانہ کمال وفن پر ہماری لب کشائی چھوٹا منہ بڑی بات کے مترادف ہے۔ خود مہاراجہ اطلب اللسان ہیں کہ :

حضرت داغ سلمہ کا آفتاب دکن میں چمکا۔ ان کے کلام کی دھوم ہوئی چو طرف ان ہی کے کلام کے وصف کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ ایسی سادگی و پُرکاری شعر گوئی میں دوسرے کو کہاں نصیب ہوسکی۔ میں نے بھی ابتداء میں ان ہی کے سر استادی کا سہرا باندھا۔ اس اثنا میں میری مشق اردو میں ایک حد تک استاد کے اطمینان کے لائق ہو گئی۔"

جلیل القدر نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل

دُنیائے شاعری میں سخن سنجی اور غزل گوئی میں جو ہمہ گیر مقبولیت استاد جلیل کو ملی وہ بہت کم شعراء کے حصّہ میں آئی۔ مہاراجہ نے استاد داغ کی وفات سنہ ۱۳۲۲ھ (تیرہ سو بائیس ہجری) کے بعد جناب جلیل سے مشورہ سخن کیا جامعہ عثمانیہ کے میگزین جلیل نمبر میں شاد کے کلام پر جلیل کی اصلاحیں موجود ہیں ممتاز ادیب و نقاد جناب منظور احمد منظور نے اپنے مضمون "مہاراجہ کشن پرشاد" میں علامہ عبداللہ عمادی، علامہ شوشتری اور مسعود علی محوی کو بھی ان اساتذہ میں گنا ہے جن سے مہاراجہ نے اپنے کلام پر اصلاح لی۔ مہاراجہ میں کس بات کی کمی تھی؟ قسّام ازل نے منصب جاہ و اقبال سے نوازا تھا۔ ہر فن میں صاحب کمال اور بڑے عالم فاضل تھے۔ طرز خاص کے انشا پرداز اور ہمہ دان شاعر تھے۔ ریاست حیدرآباد جیسی بڑی مملکت کے سب سے بڑے عہدہ پر فائز تھے لیکن سادگی، خاکساری اور انکساری ان کی سیرت کے کچھ ایسے تابناک اور نمایاں اوصاف تھے کہ ہمیشہ اپنے آپ کو شاگرد کی حیثیت سے پیش فرماتے تھے جب کہ وہ خود استاد کامل تھے داغ کا یہ شعر مہاراجہ پر پورا اُترتا ہے :

۵ آپ اپنے کو جو شاگرد کا شاگرد گنے
داغ سا ہم نے تو استاد نہ دیکھا نہ سنا

مہاراجہ شاد کی تاریخ وفات

نصف صدی کا قصہ ہے یہ دو چار برس کی بات نہیں لیکن پھر بھی مہاراجہ بہادر کو دیکھنے والے لوگ ابھی بقید حیات ہیں۔ مہاراجہ بہادر سر کشن پرشاد شاد یمین السلطنت ہندوستان کی سب سے بڑی دیسی ریاست سلطنت آصفیہ کے پیشکار اور صدر اعظم تھے۔ ان کی زندگی میں اور ان کے انتقال کے بعد کئی کتابیں اور مضامین ان پر محققین و مورخین نے لکھے۔ وہ کوئی گمنام شخصیت نہ تھے لیکن تعجب ہے کہ سوانح نگاروں نے جو تاریخ وفات ان کی لکھی ہے ان میں اختلاف موجود ہے۔ مثلاً

۱. نواب مہدی نواز جنگ کی مرتبہ سوانح عمری "مہاراجہ کشن پرشاد" بڑی معتبر اور مستند سمجھی جاتی ہے۔ نواب صاحب لکھتے ہیں:

"[۴] ربیع الآخر سنہ ۱۳۵۹ھ مطابق (۳) مئی ۱۹۴۰ء موافق (۸) تیر ۱۳۵۰ ف روز دوشنبہ انھوں نے متاع جان کو حقیقی مالک کے حوالے کر دیا۔" ص ۲۵

۲. جناب سید مظفر حسین برنی صاحب "کلیات مکاتب اقبال" جلد اول میں رقمطراز ہیں: "(۹) مئی ۱۹۴۰ء کو انتقال ہوا۔" ص ۹۳۹

۳. جناب رامن راج سکسینہ صاحب ایڈوکیٹ نے اپنی مولفہ تاریخ "تذکرہ دربار حیدرآباد" میں مہاراجہ شاد کی تاریخ وفات یہ لکھی ہے:

[۸] تیر ۱۳۴۹ ف م [۳] جولائی ۱۹۴۰ء روز دوشنبہ دن کے چار بج کر پانچ منٹ شام مہاراجہ نے انتقال کیا۔ ص ۲۲۱

۴. جناب ڈاکٹر حبیب ضیاء صاحب کا پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ "مہاراجہ کشن پرشاد

حیات اور ادبی خدمات" کتابی صورت میں شائع ہوا ہے۔ موصوف کی تحقیق یہ ہے:

"[۸] تیر ۱۳۴۹ف م ۱۹۳۹ء روز دوشنبہ (۷۶) سال کی عمر میں انتقال کیا۔" ص۴۱

۵۔ راقم الحروف کے تایا جناب محمد کریم الدین خان صاحب مرحوم سابق تحصلدار ورنگل کی بیاض میں مہاراجہ بہادر کی تاریخ وفات اس طرح درج ہے:۔ "تاریخ (۵) ربیع الثانی ۱۳۵۹ھ م (۸) تیر ۱۳۴۹ف م (۱۳) مئی ۱۹۴۰ء یوم دوشنبہ بوقت چار ساعت شام مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت کا انتقال ہوا۔"

یہ معلوم کرنے کے لیے کہ آخر کس تاریخ وفات کو درست اور صحیح سمجھا جائے ہم نے مہاراجہ بہادر کی تاریخ وفات کے دو ماخذ دیکھنا کافی جانا۔ ایک اعلیٰ حضرت حضور نظام نواب میر عثمان علی خان آصف سابع کا فرمانِ مبارک جو مہاراجہ کے انتقال پر جریدہ غیر معمولی میں شائع ہوا تھا۔ دوسرا ماخذ اس دور کا مشہور اردو روزنامہ "رہبرِ دکن" ہے جس میں مہاراجہ بہادر کے انتقال کی تفصیلی خبر موجود ہے۔ فرمانِ مبارک کا پہلا جملہ یہ ہے:

"افسوس کل مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت کا انتقال ہوگیا۔"

فرمان مبارک کے آخر میں تاریخ (۶) ربیع الثانی ۱۳۵۹ھ لکھی ہوئی ہے۔ اخبار رہبر دکن میں تاریخ وفات (۵) ربیع الثانی ۱۳۵۹ھ (۸) تیر ۱۳۴۹ف (۱۳) مئی ۱۹۴۰ء روز دوشنبہ ۴ بج کر تین منٹ بتائی گئی ہے۔ اس لحاظ سے بیاض میں درج مہاراجہ شاد کی تاریخ وفات بالکل درست اور مستند ہے۔ اب قابلِ غور یہ ہے کہ دکن کی معروف شخصیت کی تاریخ وفات لکھنے میں مورخین نے اتنی واضح فروگذاشتیں کی ہیں جن کو انتقال کئے ہوئے صرف پچاس برس ہوئے ہیں تو چار سو سال کے تاریخی واقعات کس حد تک مستند ہیں اور کس حد تک تحقیق طلب ہوں گے؟

معشوقہ سرشار مکرم

اردو کے مایۂ ناز ادیب اور شاعر پنڈت رتن ناتھ سرشار جب سنہ ۱۸۹۵ء میں حیدرآباد دکن وارد ہوئے تو مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد مدارالمہام دولت آصفیہ نے ان کو اپنا مہمان بنایا اور بڑی قدردانی کی سرشار زندہ دل ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے بلانوش بھی تھے۔ طبیعت رنگین اور مزاج عاشقانہ تھا۔ ممولا جان طوائف سرشار کی منظورِ نظر تھی جو ہمیشہ ان کے ساتھ رہتی تھی! اس زمانہ میں راقم کے والد محمد رحیم الدین خان صاحب رحیم بر بنائے روابط قدیم مہاراجہ بہادر کے دربار میں جایا آیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ مہاراجہ نے ان سے ممولا جان کا سراپا لکھنے کی فرمائش کی۔ مہاراجہ کے پیشِ نظر شاید اپنے مہمان سرشار کو خوش کرنا تھا۔ تعمیل حکم میں انھوں نے ممولا جان کا سراپا تو لکھا لیکن سراپا کو طنز و مزاح کے گل بوٹوں سے سنوارا اور مہاراجہ بہادر کی ایک خاص محفل میں جناب سرشار اور ممولا جان کی موجودگی میں سنایا۔ سرشار خاموش سراپا سنتے رہے اور مسکرا کر داد بھی دی لیکن ممولا جان از سرتاپا آگ بگولہ ہوگئی۔

ساقی مئے گُل رنگ کا اک آدھ پیالا
صدقے ترے سیجانے کے لا جلد کہیں لا

ہو نشہ مگر نشہ میں ہو تازہ کرامت
ہو کیف مگر کیف میں ہو کیف نرالا

یہ کیوں کہ سراپا مجھے لکھنا ہے ادھر سُن
ہے جس کی جوانی میں ضعیفی کا تحلا

وہ کون کہ معشوقہ سرشار مکرم
وہ کون کہ ہے نام نجس جس کا ممولا

تضمین فرمائی۔ اعلیٰ حضرت کی سات شعروں پر مشتمل اس مشہور و معروف غزل میں مصرعہ اولیٰ تو "مصرعہ ہنار گان عالی ہے"۔ اور ثانی مصرعہ رسا کا ہے۔ صرف تین مصرعوں میں خط کشیدہ لفظ کی حد تک اختلاف ہے۔ مخفی مبادکہ جناب رسا نے اس وقت اپنی یہ نظم سنائی تھی جب حضور نظام کی عمر ان کی پیدائش ۱۳۰۳ھ کے لحاظ سے صرف گیارہ سال تھی یادشاہ ہونے کے بعد اعلیٰ حضرت آصف سابع نے یہ غزل ارشاد فرمائی تھی لاریب حضور کی تضمین سے لطیفۂ غزل دوبالا ہو گیا۔

بہت سی مشکلیں جھیلی ہیں اس غفلت کے ہاتھوں سے
ابھی حصہ میں ہیں کیا جانے کیا کیا سختیاں باقی
رسا (رسوا)

محبت میں نہ دل باقی نہ ہے تاب و توان باقی
ابھی حصہ میں ہیں کیا جانے کیا کیا سختیاں باقی
شاہ عثمان

مسلمانو اٹھو چونکو چلو کس نیند سوتے ہو
نکل آیا ہے دن اور ہے ابھی خواب گران باقی
رسا (رسوا)

شب و شینہ کی بدمستیاں میں کیا کہوں ساقی
نکل آیا ہے دن اور ہے ابھی خواب گران باقی
شاہ عثمان

مسلمانو یہ طوفان اور یہ غفلت اور یہ کشتی
نہ لنگر جس کا باقی ہے نہ جس کا بادبان باقی
رسا (رسوا)

خدا ہی کشتیٔ دل کا ہے حافظ بحر الفت میں
نہ لنگر جس کا باقی ہے نہ جس کا بادبان باقی
(شاہ عثمان)

کہاں تک قوم کا نوحہ سنیں گے آپ رسوا
شب آخر ہو چکی لیکن ابھی ہے داستان باقی
رسا (رسوا)

زبان شمع سے سنتا ہوں قصہ سوز الفت کا
شب آخر ہو چکی لیکن ابھی ہے داستان باقی
شاہ عثمان

خدا کا نام لے کر منزل مقصود چل نکلو !
غنیمت ہے کہ اب تک ہے نشان کاروان باقی — رسا (رسوا)

سراغ آخر کو مل ہی جائے گا یاران رفتہ کا
غنیمت ہے جو اب تک ہے نشان کاروان باقی — شاہ عثمان

لیا سب صنعت و حرفت کا حصہ خوشہ چینوں نے
مگر جو جد کے لب پر رہ گئی آہ و فغان باقی — رسا (رسوا)

گل و ریحان و سنبل سب خزاں میں ہو گئے رخصت
مگر بلبل کے لب پر رہ گئی آہ و فغان باقی — شاہ عثمان

دکھا اے طبع جوہر مدح سلطانِ دکن میں کچھ
ابھی ہے تیری جوت کا بہت سا امتحان باقی — رسا (رسوا)

کہ جس کے عہد نہضت میں ہم شاد و خرم ہیں
مسلمانوں کا جس کی سلطنت سے ہے نشان باقی — رسا (رسوا)

سلاطین سلف سب ہو گئے نذر اجل عثمان
مسلمانوں کا تیری سلطنت سے ہے نشان باقی — شاہ عثمان

بے نظیر شاہ وارثی کو

بلا طلب و سوال وظیفہ

اردو زبان کے شاعر بے نظیر شاہ وارثی واقعی شاعر بے نظیر بھی تھے۔ کٹرا الہ آباد کے متوطن اور حضرت امیر مینائی کے شاگرد غزل میں ان کا ایک منفرد رنگ تھا نیچرل مثنویاں اور نظمیں خاص انداز کی کہہ کر دامن اردو کو بہت کچھ نوازا ہے مشرب فقیرانہ تھا اور زندگی متوکل علی اللہ تھی۔ اُستاذی محترم محمد اکبر الدین صدیقی صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ (وظیفہ یاب) نے سنہ ۱۹۵۸ء میں "کلام بے نظیر" کے عنوان سے بے نظیر شاہ کے فرزند سید حامد بے نظیر کے تعاون سے ان کا کلام مرتب و شائع فرمایا ہے۔ سوانح عمری انداز کے مقدمہ میں بے نظیر شاہ کے حالات زندگی بھی بیان فرمائے ہیں۔ کتاب پڑھنے سے معلوم ہوا کہ پہلی مرتبہ بے نظیر شاہ سنہ ۱۹۰۰ء میں حیدرآباد تشریف لائے تھے اور سنہ ۱۹۰۹ء میں واپس ہوگئے۔ دوسری مرتبہ سنہ ۱۹۱۹ء حیدرآباد آئے۔ جب حضور آصف سابع ورنگل گئے تو نواب قطب یار جنگ تعلقدار نے بے نظیر شاہ کو اعلحضرت کی خدمت میں پیش کیا بے نظیر شاہ نے قصیدہ سنایا تو حضور نے پسند فرمایا۔ پھر اس کے بعد بے نظیر شاہ نن طب پر کتاب "گنجینۂ عثمانی" لکھ کر قصیدہ کے ساتھ خدمت اقدس میں گذرانا تھا۔ محترم صدیقی صاحب لکھتے ہیں:

"مولانا ۱۹۲۱ء میں اپنے بچوں سے ملنے کے لیے علی گڑھ تشریف لے گئے اثنا راہ میں کچھ دن بمبئی میں قیام کیا۔ کئی ایسے خطوط موجود ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اعلیٰ حضرت نظام دکن نے انھیں حیدرآباد طلب کیا لیکن مولانا نے خرابی صحت اور بچوں سے ملنے کے اشتیاق کا عذر کیا اور

علی گڈھ پہونچے" (ص ۴۴) سنہ ۱۹۳۲ء میں وہ حیدرآباد لوٹے۔ یہاں آکر بیمار ہو گئے اور پھر اسی سنہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔

بے نظیر شاہ پر کئی اہلِ علم اصحاب اور ان سے قریبی ربط رکھنے والے احباب نے مضامین لکھے ہیں لیکن تعجب ہے کہ کسی نے بھی اس وظیفہ کا تذکرہ نہیں کیا جس کو اعلیٰ حضرت حضور نظام آصف سابع نے براہِ خسروانہ بے نظیر شاہ کو تاحیات دینے کا فرمان نافذ کیا۔ اس وقت ہمارے پیشِ نظر آندھرا پردیش اسٹیٹ آرکائیوز کی فائیل قسط (۸۰) فہرست (۱) نشان سلسلہ (۱۴) موجود ہے جس میں اس عطیہ سلطانی کی روداد درج ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ مانگنے والوں کو تو سب ہی دیتے ہیں لیکن بے مانگے کسی کی امداد و حاجت روائی کمال کرم ہے ایسی مثالیں زمانہ قریب کے فرماں روائے دکن حضور آصف سابع نواب میر عثمان علی خان کے عہد زرین میں ملتی ہیں۔ شاہ عثمان کی علمی سرپرستیوں اور شاہانہ روز فیاضیوں کا سارے ہندوستان میں شہرہ تھا۔ نامی گرامی علماء و فضلاء اہلِ حاجت اور مستحقین امداد سب ہی کشاں کشاں چلے آتے تھے مگر بے نظیر شاہ نے کسی متوسل دربار سے شاہ دکن کی جناب میں کوئی معروضہ بھیجا نہ اپنی سفارش کا کسی کو ذریعہ بنایا۔ بغیر کسی تحریک اور عرضداشت کے وہ اعلیٰحضرت خسرو دکن کے یوں مورد الطاف شاہانہ ہوئے کہ یکایک نثر شاہی کنگ کوٹھی مبارک سے صدر اعظم باب حکومت کے نام فرمان عطوفت نشان صادر ہوکر:

"ایک شخص جن کا نام بے نظیر شاہ ہے اور جو متوکل ہیں ان کو اس ماہ سے تیس روپیہ ماہوار تاحیات ایصال ہو"۔

شرح دستخط

پنجشنبہ ۱۵ جمادی الثانی ۱۳۳۹ھ

ابھی چھ ماہ بھی نہ گذرے تھے کہ کرم بالائے کرم یہ ہوا کہ تیس روپیہ ماہوار میں مزید بیس روپیہ کا اضافہ جاری کرنے اور مع بقایہ یکمشت ادا

کرنے کا حکم ہوا۔ اس نوازش شاہانہ کا تقاضہ تو یہ تھا کہ اظہارِ تشکر کے طور
پر شاہ صاحب خود حیدرآباد آتے اور اس مناسبت سے بارگاہ خسروی
میں کوئی قصیدہ گزرانتے مگر وہ سیکڑوں میل دور اپنی جگہ اپنے اس شعر
کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔

فقیر اپنی کمبل میں بیٹھا ہے مست
پیا پے چڑھاتا ہے جام الست

غالباً منشائے خسروی یہ تھا کہ شاہ صاحب حیدرآباد آئیں تو انھیں شرف
باریابی عطا کیا جائے لیکن شاہ صاحب اپنی جگہ سے ٹس سے مس
نہیں ہوئے تو بہیم ۲ سال گزرنے کے بعد بذریعہ فرمان مبارک مورخہ
۱۴ جمادی الاخریٰ سنہ ۱۳۴۱ھ شاہ صاحب کو یہ اطلاع دینے کا
حکم فرمایا کہ اگر وہ ایک ہفتہ کے عرصہ میں حیدرآباد نہ آئیں گے تو ان کا
وظیفہ بند ہو جائے گا۔ حسب الحکم شاہ صاحب کو اطلاع دی گئی تو انھوں
نے بتوسط ناظم صاحب امور مذہبی بارگاہ خسروی میں ایک عریضہ ذریعہ
ڈاک گزرانا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ :

ان کا وظیفہ بلا طلب وسوال بندگان عالی نے خود ہی جاری فرمایا
جس کی سپاس گذاری حتی الوسع نہایت فخر کے ساتھ فقیر دعا گو نے ادا
کی لیکن اب مخلصانہ دُعا گوئی پر ایک مشکوک دھبہ غرض کا پیدا ہو گیا یعنی
حیدرآباد کی حاضری پر ادائے وظیفہ منحصر ہے۔ الحمد اللہ کہ حضور پُر نور
نے وظیفہ مسدود فرما کر اس دھبہ کو دُور فرمایا ہے۔ وہی ہوتا ہے جو منظور
خدا ہوتا ہے۔ علالت، پیرانہ سالی اور دیگر خانگی امور کی مجبوریوں کی
وجہ فی الحال وہ حیدرآباد نہیں آسکتے۔ جب ان موانع کو خدا آسان فرمائے
گا تو حاضری میں کب عذر ہو سکتا ہے۔

شاہ صاحب کا یہ جواب طبع ہمایونی پر گراں گزرا۔ فوراً وظیفہ بند کر دینے
اور شاہ صاحب کو اس کی اطلاع دینے کا حکم فرمایا۔ شاہ صاحب تو متوکل

تھے ہی اس کا کوئی اثر نہ لیا اور نہ اپنے استغنا میں کوئی فرق آنے دیا۔ اس پر کامل سات ماہ گزر گئے۔ شاہ صاحب کی بے نیازی یہ رنگ لائی کہ شاہ حق آگاہ نے اس سے متاثر ہو کر مسدود شدہ وظیفہ پھر جاری کردیا۔ قصر شاہی سے فرمان جاری ہوا کہ:

"اگرچہ مرسے حسب الحکم پچاس روپیہ حالی ماہوار بے نظیر شاہ جو ایصال ہوا کرتی تھی وہ مسدود ہے لیکن بعد غور مکرر حکم دیتا ہوں کہ ماہور مذکور جس تاریخ سے مسدود ہے وہ ان کو ایصال کردی جائے ان کے پتہ سے اور آئندہ بھی اس پتہ سے ہر ماہ ایصال ہوا کرے۔

بے نظیر شاہ وارثی۔ بک ڈپو مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

شرح دستخط۔

۲۵ ذلحجہ الحرام ۱۳۴۱ھ پنجشنبہ

وظیفہ تو تاحیات تھا لیکن شاہ صاحب کے انتقال کے بعد ان کی صاحبزادی سیدہ فاطمہ محمود کی درخواست پر وظیفہ کا ایک ثلث ان کے نام بھی جاری ہو گیا۔ صفی اورنگ آبادی کا یہ شعر سارے واقعہ کی عملی تفسیر ہے:

اب جو بے مانگے کے مل جائے مقدر اپنا
ہم فقط حوصلۂ اہل کرم دیکھتے ہیں

والاشان شہزادۂ نواب معظم جاہ بہادر شجیعؔ کے دو شعر

ش بخیر! میرے دوست سعید یار خان عرف "منو نواب" نواب
جنگ کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور نواب منظور جنگ
داماد تھے۔ افسوس صد افسوس اچانک حرکت قلب بند ہو جانے
مارچ ۷۶ ۱۹ء کو انتقال کر گئے۔ منو نواب شاعر تو نہیں تھے مگر
صاحب ذوق اور دلدادۂ شعر و شاعری تھے بلا کا حافظہ پایا
کی غزلیں اور نظمیں ایسی روانی سے برجستہ سناتے جیسے یہ اُن
ہے اور ان کے انداز بیان کی خوبی اور طرز ادا کی دلکشی سے
نکھر جاتا تھا۔ پولیس ایکشن کے بعد تباہی کا شکار ہوئے لیکن
انھیں شہزادہ نواب معظم جاہ بہادر کے شاہانہ دربار سے
دیا دو سو روپیہ شاہرہ مصاحبت کا ملتا تھا۔ صبح و شام موٹر
اور گھر چھوڑنے مقرر تھی ان کی دل بستگی اور ہر قسم کے ذوق
شہزادہ کے دربار میں موجود و میسر تھا۔ مجھ سے ملنے گھر آتے
شہزادۂ شجیعؔ کی غزلیں سناتے اور دربار کی دلچسپ باتیں بیان
ان کو شجیعؔ کا اتنا کلام یاد تھا کہ اگر میں انھیں حافظ کلام شجیعؔ کہوں
۔ کمال تو یہ تھا کہ نواب معظم جاہ بہادر کے شعر سنانے کے انداز
ہانہ گفتگو اور بول چال کی ہو بہو بڑی مہارت سے نقل اتارتے
لطف کی بات یہ کہ نواب معظم جاہ بہادر کی زبان کی وہ ایک ذرا
بھی شامل گفتگو کرتے تو محسوس ہوتا کہ ہم دربار میں شہزادہ کے
بیٹھے ہیں۔
دفعہ کہنے لگے نواب معظم جاہ نے فرمایا کہ غفران مکان نواب

میر محبوب علی خان کی پہلی جوان سال چہیتی صاحبزادی نظام النساء بیگم کا انتقال ہوگیا تو غفران مکان کو بڑا صدمہ ہوا اور وہ اتنے متاثر ہوئے کہ آٹھ دن تک نہ کھایا نہ پیا اور کپڑے بھی نہیں بدلے حالانکہ وہ اتنے نفاست پسند تھے کہ دن میں تین وقت کپڑے بدلتے تھے۔ آخر کار اپنی ایک غزل کے مقطع میں انھیں کہنا پڑا:

روتے پیٹتے بہت مگر آصف
مرنے والے کے ساتھ مر نہ گئے

شہزادہ شجیع بڑی شان تمکنت سے فرمانے لگے میں نے بھی اس زمین میں غزل کہی ہے۔ حضرت غفران مکان کا مقطع پیش نظر رکھ کر میرے مطلع کو دیکھو تو بڑا لطف دے گا۔

دے کے دل جان سے گزر نہ گئے
موت ممکن تھی پھر بھی مر نہ گئے

۲: نواب معظم جاہ بہادر نے ایک دن استاد داغ کا یہ شعر سنایا:

رہ روِ راہ محبت کا خدا حافظ ہے
اس میں دو چار بڑے سخت مقام آتے ہیں

پھر فرمانے لگے۔ اب میرا شعر سنو۔ اگر استاد داغ آج زندہ ہوتے تو میرے شعر کی داد دیتے:

اور شدت سے مرا ذوقِ طلب بڑھتا ہے
جب رہِ عشق میں دشوار مقام آتے ہیں

ڈاکٹر عباس علیخاں لمعہ کے کلام پر اصلاح

ڈاکٹر عباس علیخاں لمعہ اور ان کے کلام پر علامہ اقبال کی اصلاح کے بارے میں ان کے ہمشیر زادے آعظم راہی صاحب کا مضمون اخبار سیاست مورخہ ۴۔جون ۹۸ء پڑھنے کو ملا کہیں دیکھا نہ سُنا کہ علامہ اقبال نے کسی کے کلام پر باقاعدہ اصلاح دی ہے۔ اگر ڈاکٹر لمعہ کے کلام پر اقبال نے اصلاح دی ہے تو یہ بڑی بات ہے بڑا اعزاز ہے۔ جناب آعظم راہی صاحب شاید نہ جانتے ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ڈاکٹر لمعہ نے علامہ عبداللہ عمادی صاحب سے بھی استفادہ کیا ہے۔ میرے ایک بزرگ دوست جو علامہ عمادی کے ایک ارادت مند شاگرد ہیں بیان کرتے ہیں کہ ڈاکٹر لمعہ، علامہ عمادی کے مکان آیا کرتے تھے اور بعد میں بہت مخلصانہ روابط آپس میں ہو گئے۔ تعارف اور ملاقات کی ابتداء یوں ہوئی کہ جب ڈاکٹر لمعہ نے ایک مثنوی "مشرق نامہ" بزبان فارسی لکھی تو سب سے پہلے مولانا مناظر احسن گیلانی کی خدمت میں بغرض اصلاح پیش کی۔ مولانا بڑے عالم ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھے لیکن اصلاح سخن کا فن اور ہی ہے۔ مولانا نے انھیں اپنے ساتھ علامہ عبداللہ عمادی صاحب کے گھر لایا اور تعارف کے بعد مشرق نامہ پر اصلاح کی خواہش کی۔ علامہ عمادی نے شرف قبولیت بخشا اور مثنوی رکھ لی۔ بعد میں مشرق نامہ پر اصلاح فرما کر ایک خط کے ساتھ ڈاکٹر لمعہ کے پاس بھجوادی۔

خط حسب ذیل ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مخدومی۔ تسلیم بصد تکریم

الحمد اللہ کہ آج پنجشنبہ ۲۰۔ ذی الحجہ ۱۳۶۰ھ م ۶/اسفندار ماہ ۱۳۵۱ کو مشرق نامہ کے اشراق نے لواسع سخن کی تکمیل کر دی۔ اس تعبیر میں جا بجا معنوی تقصیر کا گمان ممکن ہے۔ شاید اس لیے کہ زبان ہی تک میری رسائی تھی۔ آپ کا معنی آفریں قلبِ روشن میری دسترس سے بلند تر تھا۔ تاخیر کا عذر گناہ عجب نہیں بدتر از گناہ ہو۔

بود کہ یار نپرسد گنہ ز خلق کریم ۔ کہ از سوال ملولیم و از جواب خجل

آپ نے مقدمہ کے لیے حکم دیا ہے۔ اس لیے جلد سے جلد ایک نظم حاضر ہو جائے گی انشاء اللہ۔ یہ جسارت محض اس بنا پر ہو سکتی ہے کہ بحر زخار میں لب ساحل پر خس و خاشاک بھی ہوا کرتے ہیں۔ کسی صاحب کو لکھئے کہ آ کے یہ کتاب مجھ سے لے لیں۔ اگرچہ جی تو یہ چاہتا ہے کہ آپ قدم رنجہ فرماتے اور مواجہ میں وجوہ تفسیر پیش کیے جاتے۔

والسلام بالاکرام

۱۲۔ محرم ۱۳۶۱ھ خادم عمادی

مشرق نامہ پر علامہ عمادی نے اصلاح دی مگر ان کی بلند حوصلگی اور اعلیٰ ظرفی دیکھیے کہ خط میں انہوں نے "اصلاح" کی بجائے "وجوہ تفسیر" کے الفاظ تحریر فرمائے۔ بعد میں علامہ عمادی نے نثر کی بجائے نظم میں مقدمہ لکھ کر ڈاکٹر لمعہ کو روانہ کیا جس کا ذکر متذکرہ خط میں ہے۔ اس نظم کے ۳۱ شعر ہیں۔ علامہ عمادی عربی، فارسی اور اردو کے بے مثل صاحب طرز ادیب، نقاد اور شاعر تھے ان کے فضل و کمال کا کیا کہنا۔ نظم پڑھتے جائیے تو محسوس ہوتا ہے کہ علامہ عمادی کے پردے میں اقبال بول رہے ہیں۔ مثنوی کے اشعار علامہ عمادی کے شاگرد نے ہدیتہً ہمیں عنایت فرمائے ہیں، ہم بھی اس یادگار غیر مطبوعہ مثنوی کو نذر کا پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ مشرق نامہ

کہ اشراق طبع دکتور محمد عباس علی خان است از فقیر حقیر عبداللہ العمادی۔

۱۲۔ محرم۔ ۱۳۶۱

آفرین بر لمعۂ نور ازل
ماہ در جیب آفتاب اندر بغل
لمعہ انوار عباس علی
حیدرآباد از فراغش منجلی
مشرق از انوار درخشندہ باد
آفتابش بر دکن تابندہ باد
نامہ مشرق با اسلوب نوی
لامع از نور حکیم غزنوی
در جناب معرفت تا بار یافت
رائحہ از نفحۂ عطار یافت
صدق عشقش داشت برہان قوی
سینہ اش پُر شد ز روح مولوی
دامن اقبال بگرفت از صفا
تا رساند در حریم مصطفےٰ
فیضاب از دولت جاوید شد
خاک راہ خواجہ توحید شد
طایر فکرش بہ پرواز سے جدا
اوج گیر از بام آیات ہدیٰ
درد و سوز نشان را رحیق صاف داد
آگہی از سِرّ استخلاف داد

سرِ استخلاف تمکین حق است
ارتقائے دولت و دینِ حق است
شیر مردے دام و دد را خوار گیر
سلسلہ از حیدرِ کرار گیر
مسلکِ مومن صراطِ مستقیم
شیوہ اش اعلائے قرآنِ حکیم
سربلندی را اسیرِ دون مخواہ
حکمِ قرآن بستۂ قانون مخواہ
از برائے کشورِ قلبِ سلیم
نیست قرآن غیرِ قرآنِ حکیم
مومنان محروم از اسبابِ خیر
تا بود قرآنِ حق محکومِ غیر
خیز تا قانونِ غیر از راہ باد
مصحفِ توحیدِ شاہنشاہ باد
پیکرِ توحید بے دل تا بکے
امرِ حق محکومِ باطل تا بکے
گیتی از بہرِ مسلمان ساختند
بستۂ زنجیرِ قرآن ساختند
محرمانِ بارگہِ ذوالجلال
وائے گر باشند محکومِ ضلال
سرنگوں کن پرچمِ بیداد را
بر شکن ایوانِ استبداد را
باز گیر از دستِ دیوان باز گیر
خاصہ اسلام و دیہیم و سریر

حضرت اسلام بے تمکین چرا است
جائے مسلم در صف پائین چرا است
نور تو از شمع یزدان است و بس
صدر مسند از مسلمان است و بس
باز روشن کن چراغ از نور بدر
سفلگان را تا بر اندازی ز صدر
ذرہ سان در بند بیتابی مباش
ہمچو نرگس در گران خوابی مباش
خیز و تخت از دست دیوان باز جو
باز جو ملک سلیمان باز جو
تیغ در کف رایت قرآن بہ پیش
تا مسلمان باز یابد جائے خویش
حاصل تعلیم لمعہ این بود!
جلوہ اش بہر فروغ دین بود
ملت از روح حیا تش زندہ باد
سطوت توحید از او پائندہ باد

خط کی نقل ہمارے ہاں محفوظ ہے البتہ اصلاح شدہ مثنوی کی نقل ہمارے پاس نہیں. جناب اعظم راہی صاحب نے لکھا ہے کہ ڈاکٹر لمعہ کا سارا علمی ادبی سرمایہ ان کے ہاتھ میں ہے اگر اس لاقیمت ذخیرہ میں تلاش کریں تو یہ سب نایاب نوشتے مل جائیں گے. اگر لمعہ کے کلام پر اقبال کی کچھ اصلاحیں بھی برآمد ہو جائیں تو ان کا ادعا پایہ ثبوت کو پہنچ جائے گا.

یاس یگانہ چنگیزی کی ملازمت و ترقی

واقعہ یہ ہے کہ سابق ریاست حیدرآباد میں خود حیدرآبادیوں کو ملازمت کے لیے دو صداقت ناموں کا حکومت کی جانب سے لزوم تھا۔ ایک صداقت ملکی دوسرے میٹرک یا مماثل میاٹرک کامیاب سرٹیفکیٹ۔ لیکن بیرونی شعراء یا ادیب حیدرآباد آتے اور ملازمت کے خواہاں ہوتے تو قواعد ملازمت کو بالائے طاق رکھ کر آنے والے مہمان کی ایسی فراخدلی سے پذیرائی ہوتی کہ متذکرہ لازم و ملزوم صداقت ناموں سے ان کو مستثنیٰ کر کے کسی عہدہ پر تقرر کیا جاتا یا اگر ابتداء میں کوئی عہدہ نہ بھی ملے تو بہت جلد دیکھتے کے دیکھتے وہ عہدہ دار بن بیٹھتے۔

سخن گسترانہ بات یہ عرض کرنا ہے کہ ایک کتاب "حیدرآباد میں بیرونی شعراء" حیدرآباد میں سنہ ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں ایک گراں قدر مضمون پروفیسر ڈاکٹر یوسف سرمست صاحب (شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ) کا بعنوان "یگانہ چنگیزی اور حیدرآباد" نظر افروز ہوا۔ جناب ڈاکٹر صاحب نے اپنے مضمون میں جناب نورالحسن صاحب کا حوالہ دیا ہے۔ نورالحسن صاحب لکھتے ہیں "بشیر یار جنگ جو اس زمانے میں انسپکٹر جنرل رجسٹریشن اور اسٹامپ تھے یاس کو سب رجسٹراری کی خدمت پر مامور کردیا اور مرہٹواڑہ میں ایسے مقام پر متعین کردیا جہاں کافی آمدنی تھی۔" (ص ۱۵۷)

جناب ڈاکٹر صاحب نے جناب سید اعظم دین اعظم کا بھی حوالہ دیا ہے جو رسالہ نقوش کے "شخصیات نمبر" سے ماخوذ ہے۔ ان کی تحریر کا ایک جملہ یہ ہے "انھوں نے کوئی ترقی نہیں کی اور فقط سب رجسٹرار کے چھوٹے سے عہدے پر رہ گئے۔" (ص ۱۶۲) متذکرہ حوالوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے جناب میر یاور علی خنجر کے خط کا اقتباس ملاحظہ کیجیے جو انھوں نے اپنے

استاد صفی اورنگ آبادی کو عثمان آباد سے لکھا تھا:

"مرزا واجد حسین یاس عظیم آبادی لکھنوی مصنف "چراغ سخن" چار پانچ روز ہوئے یہاں آئے ہوئے ہیں بہت فلاکت میں ہیں مگر بڑے تعلی پسند اپنے آپ کو شاعر بے نظیر سمجھتے ہیں۔ نثار احمد صاحب مزاج اول تعلقدار رائچور کی سفارش پر مرزا بشیر بیگ صاحب ناظم رجسٹریشن نے محکمہ رجسٹری عثمان آباد میں فی الحال نقل نویس کر دیا ہے۔ غالباً یہاں ان کو ۲۵ ـ ۳۰ مل جائیں گے۔ آج کل وہ یگانہ لکھنوی تخلص کر رہے ہیں۔ مجھ سے ان سے ملاقات ہوگئی ہے۔ اکثر شعر و سخن کے تذکرے رہا کرتے ہیں"۔ اس خط پر تاریخ و سنہ ۱۸ ار فروری ۱۳۳۷ ف [۲۰ فروری ۱۹۲۸ء] درج ہے۔

جناب ڈاکٹر صاحب نے لکھا کہ "یگانہ کا سب رجسٹرار کی حیثیت سے عثمان آباد پر سنہ ۱۹۲۸ء میں تقرر ہوا۔ [ص ۱۵۷]۔ چنانچہ جناب خنجر کے خط کی تاریخ کی تصدیق متذکرہ بیان سے ہو جاتی ہے نیز سنہ ۱۹۲۸ء کا تعین اس خط سے بھی ہوتا ہے جو یگانہ نے دوارکا داس شعلہ کے نام دس جولائی کو لکھا۔ ۲۰ فروری سنہ ۱۹۲۸ء جناب یگانہ رجسٹریشن آفس عثمان آباد میں نقل نویس تھے لیکن پانچ مہینے نہیں گزرے کہ بحیثیت سب رجسٹرار لاتور تعلقہ ترقی ہوئی۔ کتنوں کے حقوق پامال ہوئے ہوں گے کہ جونیر سینیر کا خیال کئے بغیر نقل نویس سے سب رجسٹرار ہو گئے! کیا اسے ترقی نہیں کہتے سب رجسٹرار "صاحب تعلقہ" اور اپنے آفس کا سربراہ ہوتا تھا۔ بات یہاں ختم ہو جاتی ہے لیکن صفی اورنگ آبادی نے اپنے شاگرد خنجر کے خط کے جواب میں جو لکھا اس کے دو ایک جملے سنانے کو جی چاہتا ہے۔ فرماتے ہیں"۔۔۔ دروغ کو فروغ کبھی نہیں ہوتا اور نقل نویس را عقل نہ باشد۔ آج ۲۵ ـ ۳۰ ہیں کل آپ منہ تکتے رہ جائیں گے کوئی ہاتھ غیب سے دستگیری کرے گا۔ بہ ظاہری اسباب ہاتھی کے دانت ہیں"۔ جناب صفی کی پیشن گوئی سچ ثابت ہوئی۔ خنجر منہ تکتے رہ گئے۔ اور یگانہ کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔

حضرت کو بھی ماننا پڑتا ہے در ایں چہ شک۔

بدنام کیا صفی کو مئے خواری نے
یہ عیب نہ ہوتا تو ولی ہو جاتے

یہ دونوں خط ادبیات اردو میں محفوظ ہیں۔

شاعری جوہر خداداد

اخبار سیاست مورخہ ۲ مئی ۱۹۹۱ء میں جناب مولوی جلال الدین صاحب کامل کا مراسلہ بعنوان صدر "آپ کا کالم" کی زینت ہے۔ مولوی کامل صاحب نے جو دلچسپ واقعہ لکھا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ داغ کو جب معلوم ہوا کہ ان کے بھتیجے نے شاعری شروع کردی ہے اور آتش تخلص رکھا ہے تو ان کو بہت تعجب ہوا۔ جب بھتیجے صاحب ملنے آئے تو داغ نے ان سے اس بارے میں پوچھا۔ جواب اثبات میں ملا تو داغ نے ایک مصرعہ

اُڑ گئی سونے کی چڑیا ہاتھ میں پر رہ گئے

دے کر طنزاً کہا کہ اس مصرعہ پر گرہ لگانے تمہیں ایک سال کی مُدت دیتا ہوں۔ بھتیجے نے یہ کہہ کر کہ چچا صاحب کون جیتا ہے تری زُلف کے سر ہونے تک فوراً ہی دوسرا مصرعہ سنا دیا:

دامن یوسف جو پکڑا ایڑ زے بن کر رہ گئے

پہلی بات تو یہ کہنی ہے کہ استاد داغ کے تمام سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ ان کے صرف ایک بھتیجے تھے جن کا نام مرزا امراؤ خاں اور تخلص نادان تھا۔ داغ کے شاگرد تھے اور حیدرآباد میں ان ہی کے مکان میں رہتے تھے۔ کچھ ایسے پڑھے لکھے تو نہ تھے لیکن شاعری کے جوہر خداداد سے کما حقہ بہرہ مند تھے ان کی بدیہہ گوئی کے کئی واقعات لکھے ہوئے ملتے ہیں، حیدرآباد ہی میں ان کا انتقال ہوا۔

دوسری بات یہ کہ جناب مولوی کامل صاحب کے متذکرہ بیان کردہ

واقعہ سے ملتا جلتا بدیہہ گوئی کا ذکر جناب نریش کمار شاد نے رسالہ بیسویں صدی کے افسانہ نمبر ۱۹۶۱ء میں بعنوان سرخ حاشیے کیا ہے۔ جناب شاد لکھتے ہیں "انور حسین آرزو لکھنوی ابھی چودہ برس کے تھے جب اُن کے محلہ کے ایک بزرگ نے ان سے ازراہ مذاق کہا۔ میاں منجو! سُنا ہے تم شعر بھی کہنے لگے ہو اگر اس مصرعہ کا دوسرا مصرعہ ایک سال میں بھی کہہ دو تو تمہیں شاعر مان لوں۔ مصرعہ یہ ہے:

اُڑ گئی سونے کی چڑیا رہ گئے پر ہاتھ میں

آرزو نے مودب ہو کر جواب دیا قبلہ! زندگی کا کیا بھروسہ سال بھر کی قید بھی کیوں؟ لیجئے آپ کی فرمائش میں ابھی پوری کئے دیتا ہوں۔ اور کچھ لمحوں کے تامل کے بعد آرزو صاحب کہنے لگے لیجئے حضرت مطلع ہو گیا:

دامن اس یوسف کا آیا پرزے ہو کر ہاتھ میں
اُڑ گئی سونے کی چڑیا رہ گئے پر ہاتھ میں

۲۔ جب بات چل نکلی ہے استفادہ کی خاطر یہ لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ یکم اپریل ۱۹۹۱ء کے "تبیات" میں جناب مولوی کامل صاحب کا ایک مراسلہ بعنوان "بدیہہ گوئی کا مقابلہ" شائع ہوا تھا مولوی صاحب نے جو کچھ فرمایا حاصل کلام یہ کہ ایک دفعہ شاہ ظفر نے استاد ذوق سے چلمن پر شعر کہنے کی فرمائش کی تو ذوق نے فی البدیہہ یہ شعر کہہ سنایا:

چق ترے دالان کی نازک بہت ہے اے صنم
کیا لگائی اس میں ہیں پلکے مگس کی تیلیاں

شعر کہنے کے بعد ذوق نے غالب سے خواہش کی کہ وہ بھی چلمن پر شعر کہیں ظفر کا اشارہ پا کر غالب نے اسی وقت تین شعر کہہ ڈالے اور ذوق کے شعر کے جواب میں طعنہ زن ہوئے:

یہ تو وہ چلمن ہے جس چلمن کی خاطر بے دریغ
باندھئے گر بندھ سکیں"

جناب کامل نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "ذوق پر غالب کا البتہ طعنہ اس دلی کدورت کو ظاہر کرتا ہے جو ہم عصر حاسدوں میں ہوا کرتی ہے۔"

جناب کامل صاحب نے ذوق اور غالب جیسے پہلوانانِ سخن کی بدیہہ گوئی کے مقابلہ کا جو واقعہ لکھا ہے وہ تعجب خیز اور قابلِ غور ہے کیوں کہ ذوق اور غالب کے تذکرہ نویسوں نے کہیں اس واقعہ کا ذکر ہی نہیں کیا ہے البتہ رسالہ نقوش لاہور کے "ادبی معرکہ نمبر" جلد دوم میں جناب ڈاکٹر تنویر احمد صاحب علوی نے ذوق اور شاہ نصیر کے معرکے کے عنوان سے چند ادبی معرکوں کا حال لکھا ہے مولوی کامل صاحب نے جس واقعہ کا ذکر کیا ہے وہ متذکرہ مضمون میں موجود ہے لیکن واقعہ کی نوعیت اور اشعار کے الفاظ اور ان کی نشست میں واضح اختلاف پایا جاتا ہے اور پھر خاص بات یہ کہ اس معرکہ کا تعلق غالب سے ذرا بھی نہیں بلکہ شاہ نصیر کے شاگرد منشی گھنشام داس عاصی نے ایک مشاعرہ میں وہ شعر کہے تھے۔ اس طرح غالب جیسے فراخ دل شاعر پر حاسدانہ دلی کدورت کا الزام خود بخود مسترد ہو جاتا ہے۔ آخر میں ہم مولوی کامل صاحب سے معروضہ کرتے ہیں کہ اپنے بیان کردہ واقعات کے مستند ماخذ کی نشاندہی فرما کر شکوک دور فرمائیں تاکہ جن جن اصحاب نے واقعہ بیان کرنے میں غلطیاں کیں ہیں ان کی اصلاح اور درستی ہو جائے۔

"شعرائے اردو کی حاضر جوابی"

اخبار سیاست مورخہ ۱۸ مارچ ۱۹۹۱ء بعنوان صدر مراسلہ شائع ہوا ہے مراسلہ نگار جناب شمیم نصرتی صاحب آرکیٹکٹ بیان کرتے ہیں کہ حضرت توفیق حیدرآبادی مصرعہ ثانی "کھیل کے دن میں لڑکپن ابھی صیاد کا"

کے لیے موزوں مصرعہ اولیٰ کی تلاش میں تھے۔ ان کے شاگرد جناب نوزر حیدر آبادی نے سنا تو فی البدیہہ یہ مصرعہ کہہ دیا۔

پر نہ کاٹا پیر توڑا بلبل ناشاد کا!

جناب رفیق مارہروی نے اپنی کتاب "بزم داغ" میں کئی واقعات استاد داغ کی زبانی سن کر لکھے ہیں۔ داغ نے بیان کیا کہ:

"۔۔۔ یہ بچہ کنور سنگھ ہی کا تھا اسے جو شرارت سوجھی جھٹ ایک کرسی پر چڑھ کر نہایت صفائی سے ایک بلبل کے پنجرے کا دروازہ کھول دیا اور بلبل کو باہر نکال کر ایک ڈور سے اس کا پاؤں باندھ لیا اور لگے صاحبزادے ہوا میں اڑانے۔ کنور صاحب، صاحبزادے کی اس حرکت کو بغور دیکھ رہے تھے۔ بڑے پُرگو شاعر تھے مجھے مخاطب کر کے بولے:

پر کے بدلے پاؤں باندھا بلبل ناشاد کا

میں نے مصرعہ سنا۔ فوراً دوسرا مصرعہ ذہن میں آگیا اور کنور صاحب سے کہا کہ لیجئے آپ کا پورا شعر ہو گیا:

کھیل کے دن ہیں لڑکپن ہے ابھی صیاد کا!

معلوم نہیں جناب نصرتی صاحب کے واقعہ کا ماخذ کیا ہے۔ اگر وہ خود اس واقعہ کے چشم دید گواہ ہیں یا کسی مستند و معتبر راوی سے سنا ہے تو پھر بدیہہ گوئی کے ان دونوں واقعات کے مصرعوں میں الفاظ کی مماثلت اور خیال کی یکسانی دنیائے ادب میں توارد کی بڑی دلچسپ مثال ہے۔

"حضرت عشقی اور ان کے تذکرہ نویس"

میلاد شریف کی محفلوں، قصیدہ بردہ کی مجلسوں اور ایسے ہی مواقع پر حضرت عشقی رحمۃ اللہ علیہ کا عربی سلام بہ بارگاہ خیر الانام صلی اللہ علیہ وسلم نہایت والہانہ انداز سے پڑھا جاتا ہے اور حاضرین بڑی عقیدت

علوم و فنون سے رغبت رہی۔ ابتدائی عربی و فارسی تعلیم حسبِ ضرورت اپنے والد منشی محمد حسین صاحب سے حاصل کی اور پھر مشہور پیر طریقت حضرت سید افتخار علی شاہ صاحب وطن رحمتہ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے۔ حضرت عشقی نے اس دیباچہ میں اپنے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ اردو فارسی دیوان کا ذکر کرتے ہوئے اپنے واردات قلبی کا جذب و کیف اور رویائے صادقہ کو پُراثر انداز میں لکھا ہے۔

حضرت عشقی نے بلدہ حیدرآباد میں عمر کا ایک بڑا حصّہ گزارا اور یہیں آخری سانس لی۔ نواب سالار جنگ اول (نواب میر تراب علی خان) کی والدہ ماجدہ کی سرکار میں اپنے والد کے انتقال کے بعد اپنی موروثی جائیداد پر بحیثیت نائب جاگیر کام انجام دے کر وظیفہ پر سبکدوش ہوئے چنانچہ اپنے دیوان "محامد محمدی" کی طباعت کے بعد ایک نسخہ پر بقلم خود حسبِ ذیل تحریر لکھ کر نواب سالار جنگ (نواب یوسف علی خاں) کی خدمت میں پیش کی :

هو الله العزيز

دیوان اول نعتیہ عشقی موسوم بہ محامد محمدی الموصوف بہ توصیفات مصطفوی بشرف ملاحظہ سرکار فیض آثار عالیجناب نواب سالار جنگ بہادر دام اقبالہٗ صدر المہام سرکار عالی طبعزاد و گذرانیدہ غلام مصطفیٰ تخلص عشقی نمکخوار قدیمی نائب جولور جاگیر۔

مصرعہ

گر قبول افتد زہی عز و شرف

رباعی طبعزاد عشقی

سالار جوان بخت یہ سالار رہے ؛ سر پر سرے بس سایۂ سرکار رہے
اس در کے سوا جائے کہاں اب عشقی ؛ مدت سے اس در کے نمکخوار رہے

(شرح دستخط) غلام مصطفیٰ عشقی غفر اللہ لہٗ (کتاب خانہ سالار جنگ نمبر کتاب ۳۹۴)

حضرت عشقی حیدرآباد کے مشاعروں میں شرکت بھی فرماتے تھے. چنانچہ حضرت میر شمس الدین محمد فیضؒ کے عرس کے موقع پر مزار حضرت فیضؒ واقع لال دروازہ میں طرحی مشاعرہ میں پابندی سے شریک ہوتے تھے اور فارسی واردو طرح میں اپنا کلام سناتے تھے. اس قدیم یادگار مشاعرہ میں جن شعراء کا کلام پڑھا جاتا یا جو غزلیں ذریعہ ٹپہ وصول ہوتیں ان کا مجموعہ "گلدستہ فیض" کے نام سے بانی مشاعرہ حضرت نواب مشرف جنگ فیاض شائع فرماتے تھے. ان گلدستوں میں حضرت عشقی کا طرحی فارسی واردو کلام موجود ہے. "گلدستہ فیض" دیکھنے سے یہ واضح ہے کہ حضرت عشقی فارسی واردو طرحی مصرع پر دو غزلیں کہتے تھے ایک عشقیہ اور ایک نعتیہ. اردو طرح پر چند شعر حسب ذیل ہیں:

طرح: مزار فیض پر اللہ کی رحمت برستی ہے [۱۳۲۵ھ]

ع: شراب عشق سے ہوں مست مجھکو جوش مستی ہے
سرا مذہب ہے رندی کا مرا پیشہ پرستی ہے

ن: شراب عشق احمد سے یہ حاصل مجھکو مستی ہے
خبر یہ بھی نہیں کیا ہے عدم کیا چیز ہستی ہے

طرح: فصل گل آئی گھٹا چھائی ہے ۱۳۲۶ھ

ع: لب پہ اب ہجر میں جان آئی ہے ؛ مژدۂ وصل قضا لائی ہے

ن: باغ طیبہ سے صبا آئی ہے ؛ بوئے گل صل علیٰ لائی ہے

طرح: اس کا سایہ جو گرے یوسف ثانی ہوجائے ۱۳۲۷ھ

ع: یار نازک ہے طبیعت بھی ہے نازک اسکی
ہو سکے بات تو بس دل پہ گرانی ہوجائے

ن: مرتبہ ہوتا ہے بقا کا اسے حاصل عشقی
عشق محبوب الٰہی میں جو فانی ہوجائے

طرح: سیر جو ساحت دل میں ہے گلستاں میں نہیں. ۱۳۲۸ھ

ع: بادشاہ سارے حسینوں کا ہے وہ یار حسین
حسن ایسا تو کسی حور میں غلمان میں نہیں

ن: سب حسینوں سے ہیں محبوب خدا بڑھ کے حسین
حسن ایسا تو ملک میں نہیں انسان میں نہیں

حیدرآباد میں جناب محمد عبداللہ خان ضیغم مشاعرے منعقد کرتے تھے حضرت عشقی ان مشاعروں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ مشاعرہ کے گلدستوں میں عشقی کا کلام ملتا ہے چنانچہ غفران مکان نواب میر محبوب علی خان کی بتیسویں ۳۲ سالگرہ کی مسرت میں منعقدہ مشاعرہ کے گلدستہ "جشن آصفیہ" (۱۳۱۵ھ) میں حضرت عشقی کی دو ۲ رباعیاں اور "غزل دعائیہ" کے عنوان سے بارہ شعر ملتے ہیں۔ چند شعر تبرکاً پیش ہیں:

یہ سال بادشاہ کو مبارک خدا کرے	ان کو حیات خضر و مسیحا عطا کرے
سائل کو احتیاج نہ ہو پھر سوال کی	یوں کامیاب شاہ کا دست سخا کرے
مشہور ایسی ان کی عدالت جہاں میں ہو	دلبر بھی بے دلوں پہ نہ جور و جفا کرے
حاجت روائی کرتے ہیں جیسی یہ خلق کی	ان کی خدا بھی ایسی ہی حاجت روا کرے
باغ دکن کی ان کو دکھائے خدا بہار	یہ باغ دمبدم یوں ہی پھولا پھلا رہے
لکھے ہیں چند شعر یہ میں نے دعائیہ	بہر نبی قبول خدا یہ دعا کرے

یہ بات بڑے حیرت کی ہے کہ جناب ضیغم کے مرتب کردہ "تذکرہ شعراء یادگار ضیغم" (۱۳۳۴ھ) میں جو بہ شکل مخطوطہ ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد (نمبر ۵۶۴) میں محفوظ ہے اور جس میں شمالی ہند اور دکن کے تقریباً پانچ سو سے زیادہ شعراء کا ذکر موجود ہے اس میں حضرت عشقی کا کوئی ذکر نہیں۔ البتہ جناب ترک علی شاہ ترکی نے اپنے تذکرہ "سخن وران چشم دیدہ" میں صرف دو جملے لکھتے ہوئے ان کی فارسی غزل کے سات شعر لکھے ہیں:

"عشقی تخلص غلام مصطفیٰ نام حیدرآبادی۔ روزی در مشاعرۂ فیض دیدہ بودم۔ حال علم و سنین عمر یاد نماندہ۔ ابن شعر از فکر اوست"۔ [ص ۹۰]

حضرت عشقی کے قریبی رشتہ دار اور دوست احباب ان کے وطن بیدر میں رہتے تھے مگر اس وقت کسی نے بھی ان احباب سے عشقی کے حالاتِ زندگی معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ رشتہ دار تو پاکستان منتقل ہو گئے اور جو یہاں رہ گئے وہ ایک ایک کر کے دُنیا سے رخصت ہوئے۔ اس طرح اہلِ دکن کی بڑی بدنصیبی ہے کہ دکن کے مایۂ ناز نعت گو شاعر کے حالات زندگی گمنامی کے پردے میں گم ہو گئے۔

ابھی ایک سال پہلے حضرت عشقی پر پہلا تحقیقاتی مضمون بہ عنوان "ملیبارۂ نعت حضرت ابوالولا غلام مصطفیٰ عشقی بیدری۔ ایک تعارف" بڑے اشتیاق و ذوق سے پڑھا جو جناب حنیف سیف ہاشمی صاحب ریسرچ اسکالر اردو گلبرگہ یونیورسٹی نے ایک سیمینار میں پڑھا تھا جو بہت سراہا گیا اور جو بعد میں ان کی مصنفہ کتاب "نقطہ نظر" میں شائع ہوا۔ جب ہم نے یہ مضمون پڑھا تو حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ جناب حنیف سیف ہاشمی صاحب نے وہی سب حال وقال دُھرا دیا جیسے حضرت عشقی نے "محامدِ محمدیؐ" کے دیباچہ میں بیان کیا، حد تو یہ ہے کہ بغیر تغیر الفاظ سارے جملے من و عن حضرت عشقی کی تحریر کی پوری کاپی ہیں۔ بسوائے تاریخ پیدائش ملازمت اور تاریخ وفات اور کچھ اضافہ نہیں ہے۔

اسی دوران سال ۱۹۹۰ء ماہ فروری کے ماہنامہ سب رس حیدرآباد میں جناب مولوی عبدالغفار خان ظفر صاحب کا ایک اور محققانہ مضمون "ابوالولا غلام مصطفےٰ عشقی اور ان کا نعتیہ کلام" نظر افروز ہوا۔ صاحب موصوف سے مضمون کو ہم نے کئی بار بصد جذبۂ شوق پڑھا۔ واقعی ہم یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت عشقی پر یہ پہلا تفصیلی مضمون ہے جس سے عشقی کے بارے میں چند اہم اور کام کی باتیں معلوم ہوئیں۔ ان کے بزرگوں کا حال، ملازمت اور خاص طور سے ان کی شادی، بیوی بچوں اور دامادوں کے متعلق بڑے دلچسپ معلومات فراہم کئے ہیں۔ غیر مطبوعہ کلام بھی لکھا ہے۔ فارسی اور اردو دیوان

ہیں مندرج قصیدے، غزلیات اور اشعار کی تعداد بھی بتائی ہے اِتنے قیمتی اور معلومات آفرین تبصرے کے باوجود جو بات کھٹکتی ہے اور حیرت میں ڈالتی ہے وہ ہے جناب حنیف سیف ہاشمی صاحب اور مولوی عبدالغفار خاں ظفر صاحب کے مضامین میں تحریر کی یکسانیت اور مماثلت۔ اور پھر حیرت بالائے حیرت یہ کہ ہر دو مضامین کی تحریر کے الفاظ، سارے جملے اور حوالہ اشعار سوائے چند جزوی اختلاف ہو بہو وہی ہیں جن کو حضرت عشقی نے اپنے اردو دیوان "محامد محمدی" کے دیباچہ میں لکھے ہیں۔ دونوں مضامین اسی دیباچہ کے گرد گھومتے ہیں اور اسی کی آواز بازگشت معلوم ہوتے ہیں تحقیقی مسابقت میں یہ تو اور بھی خوب ہے! اور دلچسپ ہے اشائیں کئی پیش کی جا سکتی ہیں بہ خوف طوالت صرف دو نمونۂ تحریر پر اکتفا کرنے پر مجبور ہیں:

[۱] "نعت کا قصیدہ اور سلام عربی الحمد اللہ قبول ہو گیا ہے کہ بعض حاجیوں نے بعالم رویا مجلس رسول مقبول صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ وسلم میں یہ قصیدہ اور سلام عربی پڑھتے ہوئے دیکھا ہے اور سنا ہے اکثر مجالس میلاد شریف وغیرہ میں جب یہ قصیدہ اور سلام عربی پڑھا جاتا ہے تو حاضرین مجلس کی حالت جذب محبت اور جوش رقت سے بے خودی اور بے ہوشی کی ہو جاتی ہے۔" [محامد محمدی ص ۱۲]

"حضرت عشقی کے بعض قصائد و نعت اور سلام مقبول عام ہو چکے ہیں الحمد للہ مجالس میلاد شریف وغیرہ میں آپ کا سلام یا قصیدہ عربی پڑھا جاتا ہے تو حاضرین جلسہ کی حالت بسمل سی ہو جاتی ہے . . . . جذب محبت سے بے خودی اور بے ہوشی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے"۔

[نقطہ نظر ص ۲۹]

عالم رویا میں حضرت عشقی کے قصائد، نعت اور سلام عربی الحمد للہ مقبول ہو گئے ہیں کہ بعض صاحب دل بزرگان دین نے عالم رویا میں

مجلس رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم میں قصائد اور عربی سلام پڑھتے ہوئے دیکھا ہے اور سنا ہے۔ یوں بھی اکثر میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں جب قصیدہ اور سلام پڑھا جاتا ہے تو حضار مجلس پر حالت جذب محبت جوش ولولہ، رقت و بے خودی بے ہوشی کی ایک عجیب و غریب کیفیت طاری ہو جاتی ہے"۔ [سب رس ص۱۸]

[۲] "بیعت کر کے مسلک حقیقت کا سالک اور اسرار معرفت کا مائل اور تصفیہ قلبی اور تزکیہ روحی کا شاغل ہوا اور محبوب ازلی کا راغب اور مطلوب حقیقی کا طالب بنا۔ جس سے درد محبت دل درد ناک کو اور دکھانے لگا اور شعلۂ جان سوز جی کو اور جلانے لگا۔ آخر جوش محبت سے جنون کی حالت ہوئی کہ حال درد دل بغیر زبان پر لانے کے چین نہیں آتا تھا لہٰذا درد دل کا حال قصیدہ و غزل و اشعار میں لکھ کر پڑھتا اور روتا اور احباب کو سناتا تھا جس سے دل محزون کچھ تسکین پاتا تھا اور روح حزیں کو بھی کچھ مزہ آتا تھا ایک واسوخت موسوم بہ گلزار سخن جو طبع ہو چکا تھا باقی رہ گیا جس کے دو بند یہ ہیں:

گلشن حسن کا یارب نہ کوئی خواہاں ہو — اس کی گلگشت کا دل کو نہ کوئی ارماں ہو
سرو قامت پہ نہ قمری سا کوئی قرباں ہو — یاد گل رو میں نہ بلبل سا کوئی نالاں ہو
داغ تنہائی کا کھائے نہ گوارا ہو وے
پر کبھی لالہ رخوں کا نہ نظارا ہووے

چمن عشق کا کوئی بھی ہوادار نہ ہو — دل کبھی اس کے تماشے کا طلبگار نہ ہو
کسی گلرو کے تصور میں کوئی خوار نہ ہو — نرگسی چشم سیاہ کا کوئی بیمار نہ ہو
جان پر لاکھ ریاض اپنے اٹھائے کوئی
اس چمن سے بخدا دل نہ لگائے کوئی

[محامد مہدی ص۵]

"عمر بھر تزکیۂ نفس اور تصفیہ قلب میں محو رہے اور آپ پر جذب کی

کیفیت طاری ہوئی۔ اس حالت میں آپ اپنے سوز دروں اور کرب پردن کو اشعار میں ڈہاتے اور پڑھ کر رویا کرتے تھے جس سے آپ کے دل محزون کو تسکین اور روح مضطر کو چین نصیب ہوتا چنانچہ گلزار سخن میں ایک جگہ مضطربانہ فرماتے ہیں:

گلشن حسن کا یارب نہ کوئی خواہاں ہو   اسکی گلگشت کا دل کو نہ کبھی ارمان ہو
چمن عشق کا کوئی کبھی ہوا خواہ نہ ہو   دل کبھی اس کے تماشے کا طلبگار نہ ہو
سرو قامت پہ نہ قمری سا کوئی قرباں ہو
یاد گلرو میں نہ بلبل سا کوئی نالاں ہو

[نقطہ نظر ص ۲۸]

... مسلک حقیقت کے سالک اور اسرار معرفت کے قائل تصفیہ قلبی اور تزکیۂ روحی کے شاغل محبوب ازلی کے راغب اور مطلوب حقیقی کے طالب ہوئے جس سے درد محبت دل دردناک کو دکھانے لگا اور شعلۂ عشق دل جان سوز کو جلانے لگا۔ آخرش جوش محبت سے جنون کی حالت ہوئی اور آپ حال دل بزبان شعر لکھتے، پڑھتے اور روتے تھے جس سے آپ کے دل محزون کو تسکین ملتی اور روح حزیں مطمئن ہوتی تھی۔ چنانچہ گلزار سخن میں مضطربانہ فرماتے ہیں:

گلشن حسن کا یارب نہ کوئی خواہاں ہو   اسکی گلگشت کا دل کو نہ کبھی ارماں ہو
کسی گلرو کے تصور میں کوئی خوار نہ ہو   نرگس چشم سیاہ کا کوئی بیمار نہ ہو
جان پر لاکھ ریاض اپنے اٹھائے کوئی
اس چمن سے بخدا دل نہ لگائے کوئی

[سب رس ص ۱۶-۱۷]

حضرت عشقی کے واسوخت "گلزار سخن" کے چوراسی بند ہیں اور ہر بند پر نمبر درج ہے۔ ابتداء میں دو رباعیوں کے بعد واسوخت کا آغاز ان ہی دو بند سے ہوتا ہے (یعنی ایک و دو) جو حضرت عشقی نے لکھے ہیں لیکن بڑا

تعجب ہے کہ حضرت عشق نے جو بند "محامدِ محمدی" میں لکھے ہیں ان کی صحیح نقل بھی ان دونوں اصحاب نے نہیں کی۔ اصل سے نقل کرنے میں زمین و آسمان کا فرق نمایاں ہے۔ نہ قافیہ و ردیف درست نہ ترتیب برابر! چاہیئے ہم اس غلطی کو کاتب کے سر تھوپتے ہوئے فیصلہ ناظرین پر چھوڑتے ہیں۔

"گلزارِ سخن" کو مولوی عبدالغفار خان صاحب نے عشق کا دیوان ٹھہرایا ہے (ص ۲۴) لیکن حقیقت میں وہ دیوان نہیں واسوخت ہے جو سنہ ۱۳۰۳ھ (تیرہ سو تین ہجری) میں شائع ہوا۔ گلزارِ سخن کمیاب بلکہ نایاب ہے خوش قسمتی سے ناچیز کے پاس ایک نسخہ دستیاب ہے۔ اس واسوخت کے لوحِ کتاب پر حسبِ ذیل عبارت درج ہے:

طبع زاد بندہ پُرخطا غلام مصطفےٰ تخلص عشق متوطن محمد آباد عرف بیدر حال ساکن حیدر آباد دکن نائب علاقہ جناب بیگم صاحبہ قبلہ یعنی جدہ ماجدہ عالی جناب مدار المہام سرکار نظام خلداللہ ودولتہ الیٰ یوم القیام شاگرد جناب سید علی صاحب فکر لکھنوی مدظلہ العالی"

متذکرہ عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عشق فکر لکھنوی کے شاگرد تھے اور جب یہ واسوخت طبع ہوا تو ان کے استاد جناب فکر لکھنوی بقیدِ حیات تھے۔

حضرت عشق نے اپنے دیوان ہائے اردو و فارسی کے نام "محامدِ محمدی" میں لکھ دیئے ہیں۔ جناب حنیف سیف ہاشمی صاحب اور مولوی عبدالغفار خان صاحب نے ایک دیوان کا نام "گلزارِ مصطفوی" بتایا ہے (نقطہ نظر ص ۲۰۵ اور سب رس ص ۲۴) حالانکہ عشق نے اس کا نام "گلدستۂ مصطفوی" لکھا ہے۔ (ص ۶)

مولوی عبدالغفار خان صاحب رقم طراز ہیں:

"حضرت عشق کے وصال کے بعد یہ جملہ قلمی دواوین اعلیٰ حضرت شہریارِ دکن حضور نظام آصف سابع کے شاہی خزینۂ کتب میں داخل

کئے گئے جس کے عوض آپ کی زوجۂ محترمہ کو تاحیات تیس روپے ماہوار جاری ہوئی۔" [صـ ۲۴]

مولوی عبدالغفار خان صاحب نے اپنے اس بیان کا کوئی حوالہ یا شہادت پیش نہیں فرمائی اس کے برخلاف واقعہ یہ ہے کہ حضرت عشقی کے انتقال کے بعد ان کی دو بیوائیں موجود تھیں جنھوں نے حضرت عشقی کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ دیوان اعلیٰ حضرت حضور نظام کی خدمتِ اقدس میں پیش کئے تھے۔ حضور نظام نے اس کے عوض میں نہیں بلکہ براحم خسروانہ ہر دو بیوہ کو تاحیات دس دس روپیہ ماہوار وظیفہ عطا کرنے کا فرمان نافذ فرمایا۔ قدرے تفصیل یہ ہے کہ جملہ سات مجموعہ کلام پیش ہوئے جو حسبِ ذیل ہیں:

(۱). محامد محمدی [مطبوعہ]

[۲]. رفیع مناجات "

[۳]. گلزار سخن "

[۴]. گلدستہ مصطفوی "

[۵]. دیوان جلد اول اردو [قلمی]

[۶]. دیوان جلد دوم اردو "

[۷]. دیوان فارسی "

جب اعلیٰ حضرت کی خدمت میں ان کے کلام کے یہ مجموعے پیش کئے گئے تو منشائے حضور یہ ہوا کہ منجانب سرکار انہیں شائع کردیا جائے۔ چنانچہ محکمہ فینانس کو حکم فرمایا:

حکم:۔ [سات] کتابیں مؤلفہ غلام مصطفیٰ عشقی مرحوم جو میرے پاس آئے ہیں حسبِ فہرست منسلکہ مرسل ہیں۔ مرحوم کا جس قدر اردو اور فارسی نعتیہ کلام ہے اس کو بعد اصلاح منجانب سرکار طبع کرادینا مناسب ہوگا تاکہ عام لوگ اس سے فائدہ حاصل کریں اور مصنف کی بیواؤں کے نام بطور

گزارہ کچھ مقرر ہونا چاہیئے لہٰذا بوالپسی کتب اس بارے میں صدر الصدور کی رائے عرض کی جائے۔

شرح دستخط۔

پنجشنبہ ۷ ربیع الاول شریف سنہ ۱۳۲۷ھ

اس وقت صدر الصدور کی کرسی پر حضرت حبیب الرحمن خان شیروانی [نواب صدر یار جنگ] فائز تھے۔ حسب تعمیل ارشاد سلطانی موصوف نے اپنی رائے پیش کی اور یہ بھی لکھا کہ "نعتیہ کلام جو غیر مطبوعہ ہے اس کی اشاعت منجانب سرکار عالی باعث اجر و ثواب ہوگی۔ بیواؤں کے نام سات سات روپیہ مقرر فرمائے جائیں تو عین مرحم خسروانہ ہے"؟

صدر الصدور کی رائے ملاحظہ فرمانے کے بعد اعلیٰ حضرت حضور نظام نے اس میں اضافہ کرکے حکم فرمایا:

حکم:۔ مرحوم کی ہر بیوہ کے نام غزہ جمادی الاول سنہ جاریہ سے تاحیات دس دس روپیہ ماہوار جاری کی جائے۔ مرحوم کا مولفہ نعتیہ کلام جو غیر مطبوعہ ہے اس کی اشاعت منجانب سرکار پہلے ہونا مناسب ہے۔ تاکہ اس سے عوام کو فائدہ ہو۔ لہٰذا دریافت کیا جائے اس کام کے لیے کس قدر صرفہ ہوگا تاکہ اس پر غور ہوکر حکم مناسب صادر ہو۔ کتب واپس کئے جاتے ہیں۔ شرح دستخط

پنجشنبہ ۴ جمادی الاول ۷ ۱۳۲ھ

حسب الحکم معتمد امور مذہبی نے بتوسط صدر اعظم طباعت دیوان کے اخراجات کا حساب حضور نظام کی خدمت اقدس میں پیش کیا یہ بات واضح ہے کہ اعلیٰ حضرت حضور نظام حضرت عشقی کے نعتیہ کلام سے متاثر تھے اور چاہتے تھے کہ منجانب سرکار جلد اس کی اشاعت ہو۔ ہر دو فرمان اس حقیقت کے شاہد ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عشقی کے نعتیہ کلام کی اشاعت منجانب سرکار نہ ہو سکی۔ سرکاری ریکارڈ میں

طباعت کلام کی کوئی شکل باوجود تلاشِ بسیار نہ مل سکی۔ یہ بھی غور طلب ہے کہ اگر حضرت عشقی کے نعتیہ کلام کی اشاعت منجانب سرکار ہوتی تو حیدرآباد کے کتاب خانوں میں اس کے نسخے ضرور مل جاتے۔ حوالہ کے لیے ملاحظہ ہو آندھراپردیش اسٹیٹ آرکایوز ریکارڈ قسط (۸۱) فہرست نمبر (۱) نشان سلسلہ [۲۸۰]۔

حضرت عشقی کی تاریخِ وفات جناب حنیف سیف ہاشمی صاحب اور مولوی عبدالغفار خان صاحب نے ہجری مادہ تاریخ "بندۂ شیریں سخن" ۱۳۴۱ھ اور "راغب گشت" مادہ عیسوی ۱۹۲۳ء لکھا ہے۔ تاریخ پیدائش بھی ہر دو اصحاب نے لکھی ہے لیکن تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات کا کوئی حوالہ یا شہادت فراہم نہ کرسکنے کی وجہ بیان مصدقہ نہیں بلکہ مشتبہ ہے۔ تاریخ وفات نے تو عجیب شش و پنج میں ڈال دیا ہے۔ حضرات! حیرت کا یہ وہ مقام ہے جہاں تحقیق سر بہ گریباں اور ریسرچ نظریں نیچی کئے کھڑی ہے اور ہم خامہ انگشت بہ دنداں کہ اسے کیا کہیئے کی تصویر! غرہ ربیع الاول سنہ ۱۳۳۷ھ [تیرہ سو سینتیس ہجری] میں حضرت عشقی کی ہر دو بیواؤں کو ماہوار وظیفہ دینے کا فرمان صادر ہوا۔ ظاہر ہے کہ انتقال بھی اسی سنہ ۱۳۳۷ھ کو ہوا ہوگا اگر ہم جناب حنیف سیف ہاشمی صاحب اور مولوی عبدالغفار خان صاحب کی بیان کردہ تاریخ وفات سنہ ۱۳۴۱ھ [تیرہ سو اکتالیس ہجری] کو صحیح تسلیم کریں تو یہ وظیفہ ہوگی قبل از وفات شوہر کی ایک حیرت انگیز مثال ہوگی یعنی زوجین کو پہلے وظیفہ ہوا اور چار سال بعد شوہر کا انتقال!

دونوں مضمون نگاروں نے حضرت عشقی کا جائے مدفن احاطہ درگاہ حضرت اُجالے شاہ صاحب میں بتایا ہے لیکن ہمارے دوست شیخ عبدالرسول صاحب طاہر صدیقی فرزند حضرت خواجہ عبدالعلی صدیقی صاحب (جن کا ذکر ہم نے مضمون کی ابتداء میں کیا ہے) اپنے ہمراہ ہمیں لے جاکر مزار حضرت عشقی کی نشاندہی کی۔ حضرت عشقی کا مزار درگاہ حضرت بخاری شاہ صاحب

[سعید آباد] کے باب الداخلہ کے روبرو ایک اونچے چبوترہ پر ہے مزار پر کوئی کتبہ نہیں ہے۔ ہمارے پوچھنے پر جناب طٰہٰ صدیقی صاحب نے بتایا کہ اپنے والد محترم کے ساتھ وہ کئی بار بہر فاتحہ یہاں مزار عشقؔ پر حاضر ہوئے ہیں۔ عاشقِ رسولؐ عشقؔ کا ایمان اور ایقان تو یہ ہے کہ غلام مصطفٰے ہونے کی نسبت خالی نہ جائے گی۔

میں دیکھوں گا وہاں سے رات دن دیدار حضرتؐ کا
دریچہ باغ جنت کا کھُلے گا میری تربت میں

عرب و عجم کے کتنے سخن گو استادان سخن گزرے ہیں جن کی نعت گوئی تمام شاعرانہ خوبیوں کے ساتھ ایک بلند مقام رکھتی ہے لیکن دکن کے گمنام شاعر حضرت عشقؔ کے عربی سلام کو جو ہمہ گیر مقبولیت اور شہرت دوام ملی وہ کسی اور کے حصہ میں نہیں آئی ان کا سلام دنیا کے گوشہ گوشہ میں جہاں جہاں مسلمان بستے ہیں بڑے ذوق و شوق اور احترام سے پڑھا اور سنا جاتا ہے۔ ایسی مقبولیت کیوں نہ نصیب ہو جب کہ یہ سلام مقبول بارگاہ خیر الانام ہے۔

آخر میں یہ عرض کرنا ہے کہ جناب حنیف سیف ہاشمی صاحب اور مولوی عبدالغفار خان ظفر صاحب کے مضامین علمی و ادبی دنیا میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان اصحاب نے یہ مضامین لکھ کر حضرت عشقؔ پر مزید کام و تحقیق کرنے والوں کے لیے راہیں کھول دی ہیں۔

تاباںؔ ایک شاعر ایک انسان

دکن میں غزل کی آبرو اور "زنجیر و زنار" کے خالق جناب شمس الدین تاباںؔ نے ۱۰۔ اپریل ۱۹۸۵ء قیدِ ہستی سے رہائی پائی۔ شاعری کا فطری شوق لڑکپن سے رہا۔ شروع ہی سے صفیؔ اورنگ آبادی جیسے ہمہ داں استادِ سخن کی شاگردی اور تقلید نے اِن کی سخن گوئی کو ایسا نکھارا اور سنوارا کہ آخر کار مکتبِ صفیؔ کے اِن شاگردوں میں گنے جانے لگے جو اس وقت استادی کے درجہ پر فائز ہیں۔ اگرچہ انہوں نے دیگر اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن غزل کے لیے جن داخلی وخارجی لوازم احساسات اور جذبات کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان کے لیے عطیہ قدرت تھے اس لیے وہ ایک کامیاب غزل گو کے روپ میں جلوہ گر ہوئے۔ انھیں اپنے استاد صفیؔ سے بڑا جذباتی لگاؤ تھا۔ بڑی والہانہ عقیدت رکھتے تھے۔ حضرت صفیؔ کے انتقال (سنہ ۱۹۵۴ء) کے بعد ہی بطور یادگار "انجمن ادبستان دکن" کی بناء ڈالی جس کے وہ معتمد رہے۔ اس انجمن کی قرار داد کی بناء پر تاباںؔ کے ذخیرہ شعری سے اِن کے فرزند رؤف رحیم حضرت صفیؔ کی دو سو غزلیات کا انتخاب کرکے "گلزار صفیؔ" کے نام سے مرتب و شائع کرنے کی سعی کر رہے ہیں۔

جناب تاباںؔ کی علالت کا سلسلہ بڑا طویل رہا۔ بعض وقت بڑے نازک مرحلوں سے گزرنا پڑا۔ لیکن طویل بیماری میں بھی کبھی چڑچڑاپن پیدا نہیں ہوا۔ ہمیشہ صابر و شکر گزار نظر آتے۔ درد اور تکلیف کو خوش طبعی اور شاعری کے پردے میں چھپاتے تھے۔ اللہ سے زیادہ لو لگائے رکھا اور ہر ملنے والے سے خاتمہ بالخیر کی دعا کے طالب ہوئے۔ انتقال سے چند دن پہلے دواخانہ (اسری) ملنے گیا تو میں نے صحت یابی کی دعا کی فرمایا

خاتمہ بالخیر کی دُعا کرد۔ ان کی خواہش کے احترام میں میں نے کیفی کا شعر سُنایا:

دل سے دُعا نکلتی ہے کیفی تیرے لیئے
اللہ تیرا خاتمہ ایمان پر کرے

آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا ئے اور بڑی حسرت سے اپنے استاد صفی کا شعر پڑھا:

آفت کشانِ عشق کے دل ٹوٹ جائیں گے
ہیرا آخیر وقت جو آسان نہ ہوسکا

اللہ نے اِن کی دُعا سُن لی اور اللہ اللہ کہتے اس دُنیا سے رخصت ہوئے۔

حلمی آفندی

محمد عباس نام۔ تخلص حلمی۔ جناب حلمی کے دادا ڈاکٹر حاجی محمد طالب افندی اور ان کے والد محمد جعفر افندی جو ایک انجینئر تھے سنہ ۱۳۱۱ھ قسطنطنیہ سے حیدرآباد دکن آئے اور ترپ بازار میں سکونت اختیار کی۔ دکن کے مشہور تذکرہ تزک محبوبیہ جلد دوم دفتر ششم صفحہ (۳۸) پر ان دونوں کا ذِکر ملتا ہے۔ محمد طالب افندی ڈاکٹر اور ماہر سرجن تھے لیکن محمد جعفر افندی ایک اچھے انجینئر ہونے کے باوجود پیشہ تجارت اختیار کیا۔

جناب حلمی ان ہی محمد جعفر افندی کے فرزند اول تھے دوسرے فرزند عون افندی اس وقت بقید حیات ہیں۔ دونوں کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ پھر سٹی ہائی اسکول میں شریک کئے گئے جہاں سے حلمی نے میٹرک کامیاب کیا۔ اپنے نام کے ساتھ "افندی" ترکی النسل ہونے کی وجہ سے لکھتے تھے:

کیوں نہ ترکی بہ ترکی وہ بولے
ہو جو حلمی رگوں میں ترکی خون

جناب حلمی کی شادی ہمارے محلہ چبوترہ سید علی کے ایک قدیم اور مہذب شیعہ خاندان میں جناب احمد مرزا صاحب منصبدار کی صاحبزادی امیر النساء بیگم سے سنہ ۱۹۳۸ء میں ہوئی جن سے ایک صاحب زادہ علی محمد افندی اور دو صاحبزادیاں فاطمہ خانم اور اصغری خانم تولد ہوئے۔ سب صاحب اولاد ہیں۔

جناب حلمی اچھے خوش نویس بھی تھے۔ محکمہ باب حکومت کے صیغہ فرمان میں کارگزار رہے انھیں کوئی ترقی نہیں ہوئی کیوں کہ ہر زمانہ میں ترقیوں کا دار و مدار جا و بے جا سفارشوں پر رہا ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں:

عقل و ہوش و ہنر ہوا باشد
وقت بد زور و زر ہوا باشد
ریل چلتی ہے جب سفارش کی
جونیر سینیر ہوا باشد

سنہ ۱۹۴۸ء حیدرآباد میں ایک تاریخی انقلاب رونما ہوا نتیجتاً دو سو سالہ حکومت آصفیہ کا خاتمہ ہوگیا اور بادشاہت کی جگہ جمہوریت قائم ہوئی ابتداء میں معاشی مصائب۔ بے روزگاری اور پریشانیوں کا دور دورہ رہا۔ جناب حلمی حالات کا شکار ہوئے اور بغیر وظیفہ ملازمت سے دست بردار ہونا پڑا۔ لیکن حضور نظام کی مہربانی سے پرائیوٹ اسٹیٹ صرفِ خاص میں "صیغہ کارخانہ جات" میں ملازمت مل گئی۔ وہ حالات سے متاثر اور دل برداشتہ تھے۔ اقتدار آصفی کی وسعت صرف خاص تک محدود ہو کے رہ گئی تھی:

اب برائے نام اپنی وضع داری رہ گئی
دل کے بہلانے کی خاطر شہریاری رہ گئی
رہ گیا باقی معلق اقتدار آصفی
کارخانے رہ گئے نگرانکاری رہ گئی

بالآخر صرف خاص میں بھی تخفیف کا مرحلہ آیا اور جناب حلمی اس کی زد میں آئے لیکن حضور نظام نے دستگیری کی اور ساٹھ روپیہ وظیفہ تاحیات کردیا۔ ان کے لیے معاشی مصائب بڑے صبر آزما رہے۔ وہ ایک حساس اور خوددار شاعر تھے۔ یہ ان کی ضعیفی کا زمانہ تھا بہت کمزور ہوگئے تھے۔ ستم بالائے ستم انھیں بلڈ پیشر ہوگیا۔ ہر سال دہ ماہ صفر میں واپسیٔ اہلِ حرم کے سلسلہ میں "شبیر ابن حیزلیم" کی شبیہ بنایا کرتے تھے اور یہ فریضہ تقریباً پچاس (۵۰) سال سے بارگاہ حضرت ابوالفضل العباسؓ (دیوان دیوڑھی) میں بجالاتے تھے چنانچہ ۱۹ صفر سنہ ۱۳۹۷ھ (۸ فروری ۱۹۷۷ء) صبح چھ بجے اپنے فریضہ کو ادا کرنے منبر پر آئے اور مخصوص انداز میں عربی لباس میں عربی نوحہ شروع کیا۔ پہلی صدادی اور مجلس عزا میں آہ و بکا کا شور اٹھا اور یہ ادھر لڑکھڑائے اور دوسرے لمحہ روح خانۂ تن سے نکل گئی شاید اسی دن کے لیے کہا تھا:

دم بھی نکلا تو شان سے نکلا
اور کس آن بان سے نکلا
روح جس وقت جسم سے نکلی
یا محمدؐ زبان سے نکلا

انتقال کے وقت عمر (۷۵) سال تھی۔ تدفین درگاہ حضرت میر مومن صاحبؒ [میر کا دائرہ] میں ہوئی۔ قبر درگاہ کے پائیں میں اور کتبہ لگا ہوا ہے۔

وہ جتنے اچھے شاعر تھے اتنے اچھے انسان بھی تھے۔ صلح کل۔ راضی برضا۔ خوش خلق منکسرالمزاج اور خوش باش و زندہ دل۔ طبیعت میں جیسی سادگی تھی لباس پہننے میں بھی اتنے ہی باوضع اور سادگی پسند تھے۔ ستائش کی تمنا اور صلہ کی آرزو سے بے نیاز رہے:

بار ہا ہم نے آزمائش کی
اس کو حاجت نہیں ستائش کی
تو بھی کچھ اپنا شوبتا حلمی
دُنیا دیوانی ہے نمائش کی

ہم عصر شعراء کی بہت عزت کرتے تھے۔ صفی اورنگ آبادی کی شاعری کے بہت مداح تھے:

شاعرانِ دکن میں اے حلمی
مجھ کو مرغوب ہے صفی کا رنگ

حلمی کو شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ حکیم عابد علی غیور سے کلام پر اصلاح لی۔ ایک دفعہ حضور نظام نے ان کے کلام میں ایک لفظ درست کیا تب سے اس دُرستی کو اپنے لیے باعث صد افتخار سمجھا اور نام کے آگے شاگرد شاہ لکھنے لگے۔ ایک مخمسے میں کہتے ہیں:

دکن میں کس لیے رتبہ بڑھے نہ حلمی کا
خدا کے فضل سے شاگرد شہریار ہوا
کہاں سے دیکھ کہاں تک سخن نے پہنچایا

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

وہ ایک ہمہ داں پُرگو شاعر تھے۔ غزل۔ نظم۔ قصیدہ۔ رباعیات قطعات نعت۔ مرثیہ۔ سلام اور نوحہ سب میں بڑی قادر الکلامی کے ساتھ طبع آزمائی کی ہے۔ طنز و مزاح کی شاعری میں بھی انہیں کمال حاصل تھا۔ سیاسی۔ سماجی اور معاشرتی بُرائیوں اور مغربی تہذیب کی خرابیوں کی طنز و مزاح کے پردے میں خوب خبر لیتے تھے ایک غزل کے چند شعر سُنئے:-

حُسن بھی ہے نقاب کے پیچھے
مہر ہے ماہ تاب کے پیچھے
ہو گئی عمر رائیگاں اپنی
ایک خانہ خراب کے پیچھے
ہم نے ناحق عذاد
رہ کے راہ تو

ہیں وہ بے حد مرہونِ ... کا شکر
پڑ نہ جانا جواب کے پیچھے
تم کو خوفِ خدا نہیں حلمی
کیوں پڑے ہو شراب کے پیچھے

غالب کی کئی غزلوں پر خمسے لکھے ہیں۔ ایک غزل کے دو شعروں پر ان کی تضمین مجھے پسند آئی

کیا کروں کیا نہ کروں ہے ابھی منزل آگے
ضعف کے مارے قدم کانپ رہے ہیں پیر
حال یہ ہے کہ جہاں بیٹھ گئے بیٹھ گئے
بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اُٹھائے نہ اُٹھے
کام وہ آن پڑا ہے بنائے نہ بنے

شیشۂ دل میں مئے عشق بھری کس کی ہے
کچھ خبر بھی ہے کہ یہ بے خبری کس کی ہے
حق کس کا ہے یہ جادو نظری کس کی ہے
کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

طنز و مزاح میں اشعار خاص انداز سے سناتے تھے؛

دیسی انگلش مال برابر
ہو گئی کملی شال برابر
فرق نہیں ہے بال برابر
دونوں میں ہے جال برابر
کہتے ہیں یہ فال برابر
گھر کی مُرغی دال برابر
بے حیائی کا دُور دَورہ ہے
کیوں نہ تکلیف ہووے روحانی
شکل دیکھو ہمارے لڑکوں کی
نہ زنانی ہے اور نہ مردانی

وہ بے باکی سے حکومت کے نظم ونسق کی کوتاہیوں کی نشان دہی کرتے تھے۔ ہندو مسلم اتحاد کے پُرزور حامی تھے اور انتشار پسند سرگرمیوں کے سخت مخالف۔

گھر کے ہر ذرّہ کو رشک طور کرنا چاہیئے
گوشہ گوشہ کو غرض پُرنور کرنا چاہیئے
آج پھولوں میں جو پیدا کر رہے ہیں انتشار
ایسے کانٹوں کو چمن سے دُور کرنا چاہیئے

میں نے جناب حلمی کے فرزند جناب علی آفندی صاحب سے مل کر مجموعہ کلام دیکھنے کی خواہش کی تو انھوں نے صرف دس ورق کی کاپی لاکر میرے سامنے رکھ دی اور کہا بس اتنا کلام باقی رہ گیا! یہ سُن کر میں حیرت سے ان کا منہ تکنے لگا کہ حلمی جیسے پُرگو شاعر کی پچاس سالہ شعر گوئی کا دش کا حاصل صرف یہ دس ورق! ان مختصر اوراق میں جناب حلمی کی لکھی ہوئی دو چار نظموں۔ چند رباعیات وقطعات کے سواء کچھ نہیں۔ کاپی پر نام "مہر الور" لکھا ہوا ہے۔ دوسرے صفحے پر شمس العلماء، مصورِ فطرت

حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی مرحوم کی رائے جناب حلمی کے کلام کے بارے میں درج ہے:

"جناب حکیم محمد عباس حلمی افندی کو میں نے ایام قیام حیدرآباد میں کئی بڑے جلسوں میں نظم خوانی کرتے ہوئے سُنا۔ حیدرآباد کے ہندو مسلمان ان کی نظموں کو بہت شوق سے سُنتے ہیں۔ ان کو حضور نظام کی بارگاہ میں رسائی حاصل ہے اور اعلیٰ حضرت حضور نظام آصف سابع ان کو شرف ہم کلامی عطا فرماتے ہیں۔ اگرچہ حیدرآباد میں سیاسی انقلاب ہوگیا لیکن علوم و فنون کے لحاظ سے حیدرآباد اب تک اس اونچے مقام پر ہے جس پر وہ صدیوں سے تھا۔ حلمی افندی ترکی نسل سے ہیں ان کے پڑھنے کا انداز بہت دلکش ہوتا ہے اور وہ فنی جذبات و خیالات کی بہت اچھی ترجمانی کرتے ہیں۔ میں اگر شاعر ہوتا تو ان کی شاعری کی خوبیوں کو بھی یہاں لکھتا۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ ان کا مجموعہ کلام شائع ہونے کے بعد ایسا مقبول خاص و عام ہوگا جیسا کہ عام جلسوں میں ان کی نظم خوانی مقبول ہوتی ہے۔ مری دلی تمنا ہے کہ حلمی افندی کا یہ مجموعہ کلام حیدرآباد میں ہمیشہ نیک نام اور مقبول خاص و عام ہوگا۔

والسلام شرح دستخط۔ ۱۳۷۱ھ

جناب علی محمد افندی نے بتایا کہ جناب حلمی کا کلام ان کی زندگی ہی میں گم ہوگیا اور یہ حقیقت ہے کہ جناب حلمی کا کلام گم ہو جانا شعر و ادب کا ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ تھوڑا بہت کلام صاحبِ ذوق اصحاب کے ہاں محفوظ ہے۔ ان کی ایک نظم "دواخانہ عثمانیہ" طنز و مزاح کا ایک دلچسپ مرقع ہے۔ یہ ایک طویل نظم ہے۔ بہر تفریح طبع یہ یادگار نظم پیش ہے:

دواخانہ عثمانیہ

ہے جو عثمانیہ دواخانہ
کیوں نہ ہو یادگار شاہانہ

عہد زرین ہے عہد عثمانی
ہے ہر اک کام جس کا لاثانی

دل جگر کہتے ہیں یہی ہر آن
انتظام نظام کے قربان

وہ عمارت ہوئی ہے یہ تعمیر
جسکی سیاح لیتے ہیں تصویر

جو کوئی دیکھنے کو آتا ہے
طاق کسریٰ کا بھول جاتا ہے

کیوں نہ ہو دور شاہ عثمان ہے
کہ دکن رشک صد گلستان ہے

یا خدا بہر سید العالی
رہیں خوش مدظلہ العالی

ناظم وقت نارمن ورکر
ہے حقیقت میں مستعد افسر

ان کا ہر کام ہو جو قابلِ داد
کیوں نہ سرکار آصفی ہو شاد

ہے ہر اک وارڈ قابلِ تصویر
ہے یہ حسن صفائی کی تسخیر

یوں ہے ہر اک پلنگ پر بیمار
باڑ کی جیسی ہو چمن میں قطار

بسترے اس طرح ہیں پاک وصاف
چادرِ آب جیسے ہو شفاف

کیوں نہ سوئے ہر ایک بے چارہ
جب کہ ہو ہر پلنگ گہوارہ

کیا مصارف کا ہو وہ وہاں کا شمار
کہ جہاں بے شمار ہوں بیمار

کیوں مصارف نہ ہوں وہاں دن رات
جس کے ہوں سات لاکھ اخراجات

اور جہاں سیکڑوں اطباء ہیں
اپنے جو وقت کے مسیحا ہیں

ساری نرسیں یہاں کی ہیں طاؤس
اور ہر اک ڈاکٹر ہے جالینوس

سچ تو یہ ہے کہ یہ مریضوں کی
ہر گھڑی لیتے ہیں خبر گیری

صبح ہوتے ہی نرس آتی ہے
تھرما میٹر بھی ساتھ لاتی ہے

ٹمپریچر بخار کا لے کر
پھر تھرکتی چلی وہ بادِ سحر

آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے بیمار
ہو گیا یعنی ناشتہ تیار

ناشتہ کیا ہے ان مریضوں کا
اب ذرا گوش دل سے سنئے گا

اس طرح کا سلیس آ پہنچا
جیسے ہو جھریاں بھرا چہرہ

اور کچھ اس پہ ہے لگا مسکہ
جیسے ہو روئے یار پر غازہ

آپ کیا لے رہے ہو انگڑائی
لیجئے چمچوں میں چائے بھی آئی

گرم پانی کہیں کہ چائے اسے
کیا کہا جائے ورنہ ہائے لسے

دودھ ہے اس میں اور شکر ہے
کیا بتائیں مزے میں کیوں کر ہے

جسم میں چائے لاتی ہے چستی
یا بڑھاتی ہے اور بھی سستی

چائے پیتے ہی سو گئے بیمار
وقنا ربنا عذاب النار

یہ تو اس چائے کی کہانی ہے
فی الحقیقت جو گرم پانی ہے

لو بجے بارہ آئی ہے بنڈی
ہے غذا جس میں ان مریضوں کی

جب کر دی جاتی ہے غذا لاکر
غیب ہوتی ہے بھوک چکرا کر

وہ مزے دار ہوتے ہیں چاول
جس سے پڑ جائے انتڑیوں میں بل

حلق سے جب کہ یہ گزرتے ہیں
اشک رخسار پہ اُترتے ہیں

یہ تو چاول کی ہو چکی تعریف
باقی اب سالنوں کی ہے توصیف

سالنوں کا مزہ نہ پوچھئے گا
کبھی کھانسی ہو اور کبھی ٹھسکا

ہم نے بھی آزما کے دیکھا ہے
مرچ کی ڈھانس کے سوا کیا ہے

نہیں ہوتے ہیں پھر بھی یہ تائب
کہ چپاتی سے ہے نمک غائب

آنکھ پڑتی ہے جب چپاتی پر
اشتہا لوٹتی ہے چھاتی پر

کچی روٹی ہی جب میسر ہو
کہئے دردِ شکم نہ کیوں کر ہو

گر مریضوں کے ایسے ہوں کھانے
ہاضمہ کی خبر خدا جانے

ان کو ہلکی ہی سی غذا دیجئے
لیکن ایسی نہ بدمزہ دیجئے

میں نہیں کہتا کہ متنجن دو
میں نہیں کہتا کہ مرغن دو

دال روٹی ہی دونو ایسی دو
تا یہ بیمار کھا سکیں جس کو

میرے کہنے کا ہے یہی منشأ
تا کہ ہو انتظام مطبخ کا

الغرض اس طرح ہو نگرانی
دودھ کا دودھ پانی کا پانی

گر یہ حلمی حکیم ہے زندہ
سلسلہ اس کا باقی آئندہ

نرس

ساری نرسوں میں ایک ہے سندر
فی الحقیقت میں نیک ہے سندر
وارڈ میں اپنے جب یہ آتی ہے
دل کو ہر ایک کے لبھاتی ہے

اس سے سارے مریض ہیں دل شاد
کیوں نہ ہو جب کہ ہے یہ نیک نہاد
کیا بتاؤں جو اس میں ہے تسخیر
جسکی زلفوں میں مرغ دل ہے اسیر

جب یہ لاکر دوا پلاتی ہے
تن میں اس وقت جان آتی ہے
یہ اگر زہر دے شفا ہو جائے
خاک دے یہ تو کیمیا ہو جائے

کلبک ہو اس کے چال پہ صدقے
داغ مہ اس کے خال پہ صدقے
اس کا ہر ایک گال جب گل ہو
کیوں نہ اس پہ نثار بلبل ہو

اس کے رخ پر وہ سرخ ٹیکا ہے
جس کے آگے گلاب پھیکا ہے
اس کی گر روز دید ہو جائے
اپنی ہر روز عید ہو جائے

سنتفد جیسے ڈیوٹی میں ہے
اور ایسی ہی بیوٹی میں ہے

ایسی نرسیں جو ہوں یہاں دو چار
خود یہ خود تندرست ہوں بیمار

نرس ہے ایک سیکڑوں بیمار
جائے تنگ است و مردمان بسیار

بے مہری ارباب وطن کی شکایت حلمی کو بھی رہی:

مانا کہ آج شاعر ملک دکن ہوں میں
یہ بھی ہے سچ کہ زینت اہل سخن ہوں میں
غربت کا کس زبان سے حلمی گلا کروں
اپنے وطن میں رہ کے غریب الوطن ہوں میں

اس لیے انہوں نے کہا تھا:

دنیا مُردہ پرست ہے حلمی
بعد مرنے کے قدر ہوتی ہے

اب مرنے کے بعد بھی قدر کہاں ہوتی ہے:

اک رسم تھی قدیم سو موقوف ہو گئی!

واقعاتی شعر

بزرگوں سے سنے ہوئے شعر ہوں یا کسی شاعر سے کسی واقعہ پر فی البدیہہ شنیدہ اشعار وقتی طور پر بڑے دل خوش کن اور دلچسپ ہوتے ہیں۔ اگر ان یادگار واقعاتی شعروں کو کسی بیاض میں لکھ کر مقید نہ کرلیا جائے تو جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے یہ نقش و نگار طاق نسیاں بنتے چلے جاتے ہیں۔ ایسے ہی چند شعر نذر ناظرین ہیں:

[۱] قسمت کی یاوری سے ایک صاحب عہدہ دار بن گئے تو ان کا پیمانہ ظرف چھلک اٹھا اور لگے امراء کی برابری کرنے۔ ان کے رنگ ڈھنگ ایک واقف راز درون خانہ نے دیکھا تو انقلاب زمانہ کا یوں نقشہ کھینچا:

انقلاب دہر سے گو ہو چکی کایا پلٹ
پھر بھی خو بو رہ گئی اسلاف کے اخلاف میں
ساتھ رہتے تھے طوائف کے کبھی جن کے سلف
اب طوائف رکھتے ہیں ان کے خلف اسٹاف میں

[۲] اگلے وقتوں میں ایک عہدہ دار صاحب سررشتہ بندوبست میں بلائے ناگہانی بن کر نازل ہوئے۔ طبیعت میں ان کی غصہ اور بے اصولی ان کا اصول۔ ماتحت عملہ پریشان، ترسان، اور نالاں تھا۔ اتفاق سے ان عہدہ دار صاحب کے دونوں کان پیدائشی کٹے ہوئے تھے۔ اِس صورتِ حال سے فائدہ اُٹھا کر ایک من چلے نے ایک روز مقوے پر موٹے حروف میں خوش خط یہ شعر لکھ کر صبح کی اولین ساعت میں عہدہ دار صاحب کی میز پر رکھ دیا:

یوں ہی گر ہوتی رہے گی کاروائی بے اصول
کان کاٹے تھے خدا نے ناک کاٹیں گے رسولؐ

عہدہ دار صاحب اجلاس میں داخل ہو کر اپنی کرسی پر بیٹھے ہی تھے کہ ان کی نظر اس شعر پر پڑی۔ پھر کیا تھا قیامت ہو گئی۔ بہت خفا اور آتش زیر پا ہوئے بڑی انکوائری کی مگر ملزم کا سراغ نہ مل سکا۔

[۳] یہ اب سے کوئی پچاس برس پہلے کی بات ہے۔ ضلع بیدر میں کھدوائی کے دوران دو قدیم قبریں برآمد ہوئیں۔ جب ان قبروں کو کھولا گیا تو دونوں قبروں کی میت جوں کی توں صحیح وسالم موجود پائی گئیں جیسے کہ اجلا کفن پہنا کر ابھی قبر میں لٹایا ہے۔ بقول آتش:

امانت کی طرح رکھا زمیں نے روزِ محشر تک
نہ اک مُو کم ہوا اپنا نہ اک تار کفن بگڑا

صاحب قبر بزرگوں کی کرامت کا بڑا چرچا ہوا۔ ان دنوں استادِ سخن جناب حبیب اللہ وفا بیدر ہائی اسکول میں اردو کے مدرس تھے۔ اس موقع

پر موصوف نے دو شعر فرمائے تھے :

مدت کے بعد نکلی یہاں سے دو نعش پاک
اللہ کے ولی ہیں یہ دونوں شہید ہیں
لاریب اے دوستا یہ کرامت ضرور ہے
بگڑا نہ ایک تار کفن تک جدید ہیں

[۴] ۱۹۵۶ء میں زبان کی بنیاد پر ریاست حیدرآباد کے حصے بخرے ہو گئے اور وہ تین حصوں میں بٹ گیا اور تین اسٹیٹس آندھرا، کرناٹک اور مہاراشٹرا معرض وجود میں آئے۔ اس تقسیم کی کمیشن کے صدر جسٹس فضل علی صاحب تھے۔ فضل علی کے نام کی رعایت سے شاعر یوں ماتم کناں ہے :

ہو گیا تقسیم حیدرآباد از فضل علی
کیجیے اب یا علی یا علی یا علی

اس موقع پر یہ بتانا بے محل نہ ہوگا کہ تقسیم ریاست حیدرآباد کا خمیازہ ملازمین سرکار کو بھگتنا پڑا۔ بیشتر ملازمین کی خدمات مہاراشٹرا اور کرناٹکا اسٹیٹس سے وابستہ کردی گئیں۔ نتیجہ میں خاصی بڑی تعداد ترک وطن پر مجبور ہوئی۔ ان کی مخلوعہ جائیدادوں پر آندھرائی براجمان ہو گئے۔ حیدرآباد کی مہمان نوازی تو مشہور عالم ہے اہل دکن کی مہمان نوازی اور میزبانی کی روایت کو علامہ حیرت بدایونی نے اپنے طرز فکر کے سانچہ میں جس خوبصورتی سے ڈھالا ہے وہ اثر انگیز ہے :

روایات دکن کی آخری یہ میزبانی ہے
بسا کر مہمان کو میزبان تقسیم ہوتے ہیں

[۵] جناب محمد طفیل مرحوم ایڈیٹر ماہ نامہ نقوش لاہور نے اپنے مضمون "مخدومی" میں لکھا ہے :

"جب پہلے پہل شاہ نامہ اسلام لے کر حفیظ صاحب حیدرآباد دکن گئے تو ان کی خوب مخالفت ہوئی۔ امجد حیدرآبادی جیسا شریف النفس

انسان بھی کہہ رہا تھا:

ادبار بصورت دبیر آیا ہے
اک شاعر تاریک ضمیر آیا ہے
شاہنامہ اسلام کا کشکول لئے
پنجاب کا مشہور فقیر آیا ہے

(نقوش محمد طفیل نمبر جلد دوم ص ۱۲۷)

جناب ڈاکٹر سید داؤد اشرف صاحب کی تالیف "بیرونی مشاہیر ادب اور حیدرآباد" میں حفیظ جالندھری کا سنہ ۱۹۳۷ء میں شاہنامہ اسلام کی تصنیف و طباعت کے لیے مالی اعانت حاصل کرنے پنجاب سے حیدرآباد آنے کا ذکر ملتا ہے ڈاکٹر صاحب کے آرکائیوز ریکارڈ سے ان کے تحقیقی مضمون کی روشنی میں حضرت امجد کی رباعی حق گوئی اور صداقت خیال کے اعتراف کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

[۶] بعض لوگ اپنی بعض خوبیوں کی وجہ "استاد" کے نام سے مشہور ہوجاتے ہیں۔ ایسے ہی ایک استاد کی شادی کی تقریب پر ان کے ایک دوست نے ہدیۂ تبرک استاد کی خدمت میں پیش کیا:

آج استاد کی شادی ہوئی ماشاءاللہ
کس قدر دھوم ہے کیا شان ہے اللہ اللہ
دولھا صاحب کو جو دیکھا تو براتی بولے
لاحول ولا قوۃ الا باللہ!

[۷] راقم کے والد مرحوم کی استاد داغ کے برادرزادہ مرزا امراؤ خان نادان سے اچھی خاصی ملاقات تھی فرماتے تھے کہ ایک تقریب میں مہاراجہ کشن پرشاد تشریف فرما تھے لوگ حسب دستور نذر پیش کر رہے تھے ایسے وقت نشہ میں دھت نادان وہاں آگئے دربان نے روکا اور اندر جانے نہیں دیا۔ نادان نے کاغذ پر ایک شعر لکھ کر کسی نہ کسی طرح مہاراجہ

کی خدمت میں بھیج دیا۔

نذر دینے کے لیے زر تو کہاں باقی ہے
ایک پژمردہ سا دل سینے میں ہاں باقی ہے

مہاراجہ بہادر شعر پڑھ کر مسکرائے اور فوراً اندر بلالانے کا حکم دیا۔ جب نادان نے آکر سلام کیا تو بطریق قدر دانی مہاراجہ نے انھیں اپنی جیب سے نذر عطا کی۔

آخری چہار شنبہ

راقم الحروف کے والد صاحب مرحوم نے بتایا تھا کہ ان کے بچپن میں خاص تقاریب میں عید اور تہوار میں استاد اپنے نو عمر شاگردوں کو دلچسپ اور باموقع اشعار خوش خط لکھ کر دیا کرتے تھے۔ یہ حیدر آباد دکن کا قدیم دستور اور تہذیب و معاشرت تھی۔ والد مرحوم نے چند شعر آخری چہار شنبہ کے تعلق سے سناتے تھے جو ان کے اُستاد نے انھیں لکھ کر دیئے تھے۔

آخری چہار شنبہ ہے دانا
باغ و صحرا کی سیر کو جانا
قول حضرت نبیؐ نہیں ہے مگر
گلگلے پوریوں کو تل کھانا

اس آخری چہار شنبہ کے سلسلے میں یہ بات بھی دلچسپ ہوگی کہ جناب ایس۔ اے مہدی لکھنوی کسی کام سے حیدر آباد تشریف لائے تھے دلی کی سنٹرل گورنمنٹ میں اعلیٰ عہدہ پر فائز رہ چکے تھے۔ یہاں ان کا قیام نظام کلب میں تھا۔ صاحب ذوق اور سخن فہم اور سخن سنج بھی تھے۔ جن زمانے میں حیدر آباد میں موصوف کا قیام تھا اس وقت آخری چہار شنبہ کا غلغلہ بلند تھا۔ اخباروں میں سلیمانی جھیلہ اور محمدی جھیلوں کی کراسوں کے اشتہارات کی بڑی دھوم تھی۔ روزنامہ اخبارات میں جھیلوں

کی فیض رسانی کی باتیں پڑھ کر وہ بہت متاثر ہوئے۔ ان کے لیے یہ سب عجیب اور نئی باتیں تھیں۔ چنانچہ ایک دن مجھ نیاز مند کو موصوف نے ایک طبع زاد فی البدیہہ رباعی لکھ کر روانہ فرمائی۔ آپ بھی سُنیے اور داد دیجئے :

ہے قاضی الحاجات مبارک چھلہ
اللہ سے بھی بڑھ گیا ماشاء اللہ
دولت، اولاد، تندرستی کا ضامن
لاحول ولا قوۃ الا باللہ

دکن کا ایک نقاد

دکن کی خاک سے کیسے کیسے صاحبان فضل و کمال اُٹھے۔ کوئی نامور ہوئے اور کوئی گمنامی کے پردے میں روپوش ہو گئے۔ ان ہی میں سے جناب محمد کریم الدین خان ایک گوہر شب چراغ تھے جو "عطارد" کے قلمی نام سے آسمان ادب پر نمودار ہوئے چمکے اور گم ہو گئے۔

جناب محمد کریم الدین خان صاحب، حضرت نواب مشرف جنگ فیاض کے منجھلے صاحبزادے تھے جو شہر حیدرآباد میں بتاریخ ۱۲ ربیع الآخر سنہ ۱۲۹۰ھ پیدا ہوئے۔ قدیم گھرانوں کے قاعدہ کے مطابق ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی اور اس کے بعد قابل اساتذہ سے تعلیم و تلمذ کا سلسلہ رہا۔ ان کے والد نواب مشرف جنگ فیاض، حضرت میر شمس الدین محمد فیض کے بڑے عقیدت مند شاگرد تھے۔ حضرت فیض کے انتقال ۱۲۸۳ھ کے بعد پابندی اور مستعدی سے اپنے استاد کا عرس اور مشاعرہ پینتالیس ۴۵ سال تک کرتے رہے اور مشاعرہ کی طرح میں کہی ہوئی اردو اور فارسی غزلیات کو "گلدستہ فیض" کے نام سے شائع کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ہر جمعہ اپنی دیوڑھی میں مشاعرہ اور ادبی محفلوں کا اہتمام اور شعرا کی خاطر مدارات کا انتظام بڑی سرگرمی سے کرتے تھے جس کا تفصیلی ذکر مرقع سخن جلد اول ص۲۰ پر موجود ہے۔

جناب محمد کریم الدین خان صاحب کی ذہنی تربیت اور شعر و ادب کا ذوق ان ہی ادبی محفلوں اور اساتذہ سخن کی صحبتوں میں پروان چڑھا۔ نتیجتہً علمی و تحقیقی خداداد صلاحیت کے جوہر چمک اٹھے۔ اس کے علاوہ جناب فیاض کا نایاب کتاب خانہ بھی ان ہی کے تصرف میں رہا۔ جس سے خاطر خواہ انہوں نے

استفادہ کیا۔ تحصیلداری ورنگل پر مامور رہنے کے بعد تحصیل دار اور مددگار مال ضلع کریم نگر رہ کر وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوئے۔ وظیفہ کے بعد اپنے تعمیر کردہ مکان "کریم منزل" قاضی پیٹھ (ورنگل) میں مستقل سکونت اختیار کی اور اپنے آپ کو کتب بینی کے لیے وقف کر دیا۔ مکروہات دنیا سے کوئی سروکار نہ رکھا۔ فطرۃً بڑے تنہائی پسند تھے۔ صرف کتابیں ہی گویا ان کے دوست اور رشتہ دار تھے۔ مدت تک خاموش مطالعہ اور گوشہ گیری کے بعد اپنے دوست جناب عبدالرزاق صاحب بسمل کے جاری کردہ ماہانہ رسالہ "شہاب" حیدرآباد دکن میں تنقیدی مضامین کا سلسلہ بعنوان "نقد و نظر" "عطارد" کے قلمی نام سے شروع کیا۔ علم و ادب کے سچے خدمت گزار اور اُردو زبان کی ترقی و ترویج کے خواہش مند اور بہی خواہ تھے کبھی اپنی شہرت اور نام و نمود کے خواہاں نہیں ہوئے۔ نہ ستائش کی تمنا تھی نہ صلا کی پروا۔ قلمی نام "عطارد" اختیار کرنے کی وجہ بھی یہی تھی کہ خاموش علم و ادب کی خدمت کریں۔ ہر آدمی کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ اس کا کوئی مضمون اخبار یا رسالہ میں چھپے اور پھر اپنی انا کی تسکین کی خاطر چھپا ہوا مضمون دوستوں کو دکھاتا ہے اور داد سے خوش ہوتا ہے لیکن جناب عطارد نے عجیب طبیعت پائی تھی کہ برسوں رسالہ "شہاب" میں ان کے معرکتہ الآرا تنقیدی مضامین شائع ہوتے رہے جن کی حیدرآباد کے علمی حلقوں میں دھوم مچی رہی لیکن سوائے ایک دو اصحاب کے خود ان کے گھر والوں، رشتہ داروں اور دوستوں کو علم نہ تھا کہ عطارد کے قلمی نام سے لکھنے والی شخصیت کس کی ہے مرے دریافت کرنے پر جواب دیا کہ " نقد و نظر" کے لکھنے والے کو کیوں دریافت کرتے ہو اگر محض اپنی اطلاع کے واسطے پوچھتے ہو تو عطارد کے نام سے جو کچھ بھی لکھا جاتا ہے اس کا لکھنے والا میں ہوں۔ اگر کوئی اور دریافت کرتے ہیں تو کہدو کہ لکھنے والا کوئی ہو اگر صحیح لکھتا ہے تو عمل کرو ورنہ مجذوب کی بڑ سمجھ کر پھینک دو۔"

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ نواب ایرج یار جنگ سابق صوبیدار ورنگل سے ملنے گئے۔ اتفاق سے صوبیدار صاحب کے ہاتھ میں شہاب کا پرچہ تھا۔ انھوں نے جناب عطارد سے کہا کہ ایک صاحب قلمی نام سے شہاب میں شعرا کے کلام پر تنقیدیں لکھ رہے ہیں۔ بہت اچھی تنقید ہوتی ہے۔ یہ سن کر جی جی کہتے رہے مگر یہ نہیں بتایا کہ ان تنقیدوں کا لکھنے والا یہ ناچیز ہے۔ حالانکہ اپنے عہدہ دار پر رعب جمانے کے لیے ماتحتین کیا نہیں کرتے۔

جناب عطارد ایک اچھے ادیب ہونے کے ساتھ بلند پایہ تنقید نگار اور نقاد سخن بھی تھے۔ ان کے مضامین اور تنقیدوں کو دیکھ کر ان کی سخن فہمی زبان دانی، فنِ عروض پر عبور اور صرف و نحو کے قواعد میں ان کی غیر معمولی مہارت کا اندازہ ہوتا ہے ان کی تنقید اور تبصرہ کا مقصد اردو زبان کی اِصلاح و ترقی تھا یہ بات انھوں نے بار بار دُہرائی ہے کہ وہ اپنے شک شبہات دُور کرنے کی غرض سے لکھتے ہیں اور ان کے پیشِ نظر افادہ نہیں استفادہ ہوتا ہے۔ تنقیدات کے چند اقتباسات سے یہ بات واضح ہوگی:

[۱] ہم نے کسی کے کلام پر کبھی تنقید نہیں کی بلکہ بادی النظر میں جو عیوب نظر آئے انھیں کو ظاہر کیا محض اس لیے کہ اگر اعتراض صحیح ہے تو آئندہ کے لیے باخبر رہیں اگر اعتراض غلط ہے تو متانت سے جواب دے کر معترض کو اس کی اپنی غلطی سے آگاہ ہونے کا موقع دیں اس طریقہ سے نہ صرف معترض کو بلکہ دوسرے بہت سے اصحاب کو بھی فائدہ پہنچتا۔ زبان کی اصلاح اور ترقی میں مدد ملتی"۔ شہاب خورداد سنہ ۱۳۴۹ ف

[۲] ایسی تنقید سے مری اصلی غرض تو یہ ہے کہ خود مصنف یا دوسرے اصحاب بھی اس پر کچھ رائے زنی کیا کریں تاکہ مجھ کو اور دوسروں کو استفادہ کا موقع ملے"۔ شہاب آذر سنہ ۱۳۴۷ ف

[۳] ہمارے ملک کے بعض نوجوان تعلیم یافتہ افراد کے مرغوب مشاغل علمی میں سے ایک مشغلہ شعر و سخن کا بھی ہے جس کو ہم توسیع ترقی و تصحیح زبان اردو

کے لیے نیک فال سمجھتے ہیں مگر بد قسمتی سے اس مشغلہ میں ایک چیز کی کمی نظر آتی ہے اُردو ادب جس فہم و تدبر کا مستحق ہے وہ اس کو حاصل نہیں۔ یہ بھی اس کی بدنصیبی ہے کہ کسی اہلِ فن سے مشورہ کرنا بھی پسند نہیں کیا جاتا۔ اگر کوئی مفید مشورہ دیتا ہے تو اس کو تسلیم کرنے کے عوض مناظرہ و مباحثہ شروع ہو جاتا ہے ملک کے وہ افراد جن کو ادب و شعر میں درجہ اختصاص حاصل ہے بالکل خاموش ہیں وہ اس معاملہ میں دخل دینا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں ان کا ایسا سمجھنا اور خاموش رہنا حق بجانب بھی ہے۔ میں دل ہی دل میں سوچتا رہا کہ ان حالات کی اصلاح کا بہتر طریقہ کیا ہوگا عرصہ دراز کے غور و تامل کے بعد مناسب یہی معلوم ہوا کہ بعض نوجوان شعرا کے کلام پر سرسری نظر ڈالی جائے اس سے دو فائدے متصور تھے۔ خود مصنف کی توجہ اس طرف معطوف ہوگی۔ ادب اردو کے شائقین کو بھی غور و فکر کا موقع ملے گا کیوں کہ اس قسم کی علمی مباحث کی غرض و غایت ہی یہ ہے کہ الفاظ کی صحت اور محاورے کی تحقیق ہو جائے۔ میں اپنی کوتاہیوں اور خامیوں سے واقف ہوں مجھے اس کا بھی اندیشہ تھا کہ بعض طبائع کو میرا سرسری نقد بھی ناگوار خاطر ہوگا مگر جب کوئی دوسرا چارہ کار سمجھ میں نہ آیا تو دل کڑا کر کے میں نے اس بدعت کا آغاز کیا...... جن شعرا کے کلام پر میں نے اپنے شبہات ظاہر کیے ان میں کسی سے مجھے شناسائی بھی نہیں پھر ذاتی حسد یا تنقیص کیا معنی۔ شہاب اسرار ۱۳۴۸ء ف

جناب عطارد نے بیرونی اور مقامی شعرا کے کلام پر بڑی عالمانہ اور محققانہ تنقیدیں کی ہیں۔ بیرونی شعراء میں حسرت موہانی، جگر مرادآبادی، فانی بدایونی اور ماہر القادری وغیرہ اور مقامی شعراء میں علی اختر، علی منظور، عبدالقیوم خان باقی، سکندر علی وجد، صاحبزادہ میر محمد علی خان میکش اور مخدوم محی الدین وغیرہ شامل ہیں۔ شعراء کے کلام پر ان کی چند تنقیدوں سے ان کے نقد و نظر اور زبان دانی کا اندازہ ہو سکتا ہے:

[۱] حسرت موہانی:-

تو دُور ہے اور تجھ کو بھُلایا نہیں جاتا
دامن ترے ہاتھوں سے چھُڑایا نہیں جاتا

مصرعہ اولیٰ میں حرفِ عطف "اور" کا استعمال بے محل ہے۔ "اور" وصل کے واسطے آتا ہے جب کہ دو جملوں یا لفظوں کی حالت میں یکسانی ہو۔ یہاں تو دو جملوں میں مغایرت ہے اس لیے یہ موقع عطف استدراک کے استعمال کا ہے مثلاً تو دُور ہے لیکن تجھ کو بھُلایا نہیں جاتا۔ دامن چھُڑانا اُردو میں ایک محاورہ ہے جو بطور کنایہ بری الذمہ ۔علیحدہ یا جُدا ہونے کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے ؎

دامن چھُڑاکے جب سے گیا ہے وہ بے وفا
دانتوں سے کاٹتا ہوں مَیں بے اختیار ہاتھ (آتش)

مصنف نے محاورے میں تصرف کر کے "دامن ہاتھوں سے چھُڑانا" کہا ہے جس کی وجہ وہ اب کنایہ نہیں رہا اس کے حقیقی معنے ہی لیے جائیں گے۔

[۲] جگر مُرادآبادی:

مَیں نے جس بُت پر نظر ڈالی جنونِ شوق میں
دیکھتا کیا ہوں وہ تیرا ہی سراپا ہوگیا

کہنا یہ تھا کہ "جنونِ شوق" یا فورِ شوق میں جس پر نظر ڈالتا ہوں تو ہی نظر آتا ہے۔ ع جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے۔ مگر ردیف کی خاطر کہہ گئے "تیرا ہی سراپا ہوگیا"۔ یعنی تو ہی ہوگیا یہ مہمل ہے۔ اس کایا پلٹ یا قلبِ ماہیت کو نظر کی کرامت کہیں یا جنونِ شوق کا اعجاز؟

اس کو شاید ہی میسر ہو کبھی توفیقِ دید
جو اسیرِ حلقۂ امروز و فردا ہو گیا

اُردو میں توفیق دینا یا توفیق ہونا تو کہتے ہیں مگر "توفیق میسر ہونا" نہیں لکھتے قطع نظر اس کے یہ موقع "توفیقِ دید" کہنے کا نہیں ہے۔ دولتِ دید یا

دولت دیدار میسر ہو کہنا چاہیئے تھا۔ مصرعہ ثانی میں "اسیر حلقہ" بے معنی ہے اسیر پنجہ کہتے تو مصرعہ بامعنے ہوتا۔ شہاب ۱۳۵۳ھ ف

یہ فتنے جس سے اک دُنیا ہے نالاں
انھیں سے گرمئ بازار بھی ہے

"یہ فتنے" سے کون سے فتنے مراد ہیں اس کا تو کہیں ذکر ہی نہیں دنیا میں سیکڑوں قسم کے فتنے پیدا ہوتے ہیں غالب کی نظر میں سب سے بڑا فتنہ معشوق کی دوستی ہے ؎

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

خُدا جانے حضرت جگر کے ذہن میں وہ کون سے فتنے ہیں جن سے دُنیا نالاں ہے۔

(۳) ماہر القادری :۔

کس کو خبر مریض شب غم نے کیا کہا
کروٹ کے ساتھ آخری ہچکی سنی گئی

مصرعہ ثانی میں "ساتھ" کا لفظ بے محل استعمال کیا گیا جس کی وجہ یہ مفہوم پیدا ہو رہا ہے کہ جس طرح کروٹ کی آواز سُنی گئی اِسی طرح ہچکی کی آواز بھی سُنی گئی .... بالفاظ دیگر کروٹ اور ہچکی دونوں آواز ایک ساتھ سنی گئی حالانکہ کروٹ کو سماعت سے کوئی تعلق نہیں۔ قطع نظر اس کے لفظ "آخری" بھی مخل معنے ہے اس سے ہچکیوں کا تسلسل ظاہر ہو رہا ہے حالانکہ وہ مقصود نہیں۔

اس جانِ آرزو کی ندامت بھری نگاہ
محشر میں دادخواہ کے ہونٹوں کو سی گئی

"ہونٹوں کو سی گئی" بول چال کے خلاف ہے صرف ہونٹ سی گئی کہنا چاہیئے

یہ روز برق و باد یہ غمناک سی فضا
شاید کہیں بنا کے نشیمن رکھی گئی

بربادی نشیمن کے واسطے برق وباد کی ضرورت ہو سکتی ہے مگر بربادی نشیمن کے واسطے غمناک سی فضا کا تعلق مہمل ہے بنا نہادن فارسی کا محاورہ ہے مگر اُردو میں بنا رکھنا نہیں کہتے بنا ڈالنا کہتے ہیں۔ ع

عشق نے ڈالی تھی جب قصر محبت کی بنا (ذوق)

ماہر ازل کے روز جو بٹنے لگے نصیب
قسمت میں میری مرگ مسلسل لکھی گئی!

"مرگ مسلسل" بے معنے لفظ ہے شاعر کے ذہن میں شاید مرگ کی دو قسمیں ہیں ایک مرگ مسلسل اور دوسرا غیر مسلسل۔ مگر ہیں دونوں بھی مہمل۔
شہاب ماہ آذر ۱۳۵۰ف

[۴] فانی بدایونی:-

چشم تر حامل آثار جنون ہیں فانی
کھو گیا ہے اسی دریا میں بیابان میرا

"حامل آثار جنون" کی ترکیب ناقابل تقلید جدت ہے۔ "حامل آثار" صحیح نہیں دریا میں ڈوبنا یا غرق ہونا تو کہتے ہیں لیکن "دریا میں کھو جانا" وہ بھی بیاباں کا قطعاً غیر صحیح ہے تھوڑی سی تبدیلی سے اس کی اصلاح ممکن تھی اس مصرعہ کو یوں کہیں تو کیا برا ہے ع

اسی دریا میں ہوا غرق بیابان اپنا

"چشم تر کو دریا سے تشبیہ دی گئی مگر جنون" کے واسطے "بیابان" نہ استعارہ ہے نہ تشبیہ۔

ہو بھی چکے تھے دام محبت میں ہم اسیر
عالم ابھی بقید زمان و مکان نہ تھا

پہلے مصرعہ میں "بھی" کا لفظ غیر ضروری ہے مگر کیا کیا جائے مصرعہ موزوں نہیں ہوتا۔ دوسرے مصرعہ کے تعلق سے جب کا لفظ ضروری ہے اسی طرح مصرعہ بدل دیں۔ ع۔ ہم ہو چکے تھے دام محبت میں جب اسیر

[۵] علی اختر:

حریم کعبہ بنا دی وہ سرزمیں میں نے
ترے خیال میں رکھ دی جہاں جبیں میں نے

بظاہر پہلے مصرعہ کی ترکیب میں غلطی پائی جاتی ہے "بنانا" اور امدادی فعل "دینا" دونوں متعدی ہیں جس کے ساتھ اکثر دو معقول ہوتے ہیں جیسا کہ اس مصرعہ میں بھی "حریم کعبہ" اور "سرزمیں" دو مفعول ہیں۔ ایسی حالت میں مفعول اول کے ساتھ علامت "کو" کا ہونا ضروری ہے۔ یہاں مفعول اول "سرزمیں" ہے جو ضرورت شعری کے لحاظ سے آخر میں واقع ہوا "وہ" ضمیر اشارہ جملہ میں جب حرف ربط کے ساتھ آتا ہے تو "اس" سے بدل جاتا ہے "حریم کعبہ" مذکر غیر حقیقی ہے اس لیے فعل بھی اس کے تابع ہوگا۔ غرض پہلے مصرعہ کی یہ عبارت "میں نے وہ سرزمیں حریم کعبہ بنا دی" غلط ہے اس طرح ہونا چاہیئے "میں نے اس سرزمیں کو حریم کعبہ بنا دیا"۔ شہاب خورداد ۱۳۲۷ف

[۶] علی منظور:- نظم "نظام العمل"

... جب تک پوری نظم نہ پڑھ لی سمجھ میں نہ آیا کہ عنوان کس مناسبت سے تجویز کیا گیا ہے۔ اس نظم میں کچھ طفلی، شباب اور کہولت کا ذکر ہے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح ہے۔ سید الشہداؑ کی منقبت ہے اور ارکان خمسہ پر وعظ ہے غرض ایک معجون مرکب ہے جس کو عنوان سے کوئی مناسبت نہیں۔ مقطع میں "نظام العمل" کا لفظ آ گیا ہے غالباً یہ مقطع ہی اس عنوان کی تجویز کا محرک ہے۔

وہ سادہ شرارت بھی ہے اب یاد ہے کہ جب لوگ
آئینہ دکھا کر تجھے کہتے تھے اِدھر دیکھ

اس کے اوپر دو شعر ہیں جن میں طفلی، جوانی، کہولت اور بچوں کی بے وجہ شرارت اور ان کے مچلنے کا تذکرہ ہے مگر اس شعر میں شرارت کی ایک نئی قسم "سادہ شرارت" کا بیان ہے۔ اس "سادہ شرارت" سے قطع نظر "آئینہ دکھا کر

ادھر دیکھ" کہنے کا کیا مطلب ہے۔ کیا "سادہ شرارت" آئینہ میں نظر آتی ہے یا "سادہ شرارت" کو رفع کرنے کا یہ ٹونا ہے۔ عجیب تر یہ کہ کسی کا بچّہ "سادہ شرارت" کرتا ہے تو "لوگ" آئینہ دکھاتے کیوں پھرتے ہیں۔

جس پیار سے بچّوں کو تو اب دیکھ رہا ہے
تجھ کو بھی یوں ہی دیکھتے تھے مان و پدر دیکھ

ردیف گر بے کار ہو رہی ہے تو مضائقہ نہیں۔ یہ عیب تو اس طویل نظم کے اکثر و بیشتر اشعار میں پایا جاتا ہے لیکن "مان و پدر" کے عطف کو ملاحظہ فرمایئے مان اردو پدر فارسی ان کا عطف واو سے گنگا جمنی اردو ہے۔

شہاب تیر ۱۳۴۸ ف

(۷) سکندر علی وجد:-

روتے روتے آنکھ میں آنسو کی بوند
گوہر نایاب بن کر رہ گئی !!

آنکھ کو بصیغہ واحد استعمال کرنے کا یہ محل نہ تھا۔ ایک آنکھ سے کوئی کیوں کر رو سکتا ہے کیا رونے والا کانا تھا؟ طرفہ تماشہ یہ ہے کہ رونے والے کی آنکھ ایک آنسو کی بوند بھی ایک اور گوہر نایاب بھی ایک مگر رونے کی کوئی حد نہیں۔ کیا مسلۂ تثلیث کی یہ کوئی نئی تمثیل ہے؟ "روتے روتے کا مفہوم ہے تسلسل یا دوران گریہ مثلاً کہتے ہیں روتے روتے آنکھیں لال ہو گئیں روتے روتے ہنس دیئے! روتے روتے سو گئے مگر روتے روتے آنکھ میں آنسو کی بوند رہ گئی کہنا تو ہرگز صحیح نہیں۔ روتے روتے آنسو آنکھ سے ٹپک جاتے ہیں لیکن عجب بات ہے کہ کثرت گریہ کے باوجود آنسو کی بوند آنکھ ہی میں رہ گئی یہ "گوہر نایاب" موتیا بند کے واسطے استعارہ تو نہیں ہے؟ میں نہ شاعر نہ مجھے شاعری کا دعویٰ حسن اتفاق سے ایک مصرعہ ذہن میں آگیا اس کو یہاں اس لیے لکھ دیتا ہوں کہ شاید اس سے میرے اعتراض کی حقیقت پر مزید روشنی پڑ سکے ۔

چشمِ نم سے جو گری آنسو کی بوند
گوہرِ نایاب بن کر رہ گئی

اب اعتراض تو رفع ہو جاتا ہے مگر پھر بھی یہ امر غور طلب رہ گیا آخر اس شعر کا مطلب کیا ہو سکتا ہے۔ روتے روتے آنسو کی بوند کا گوہر نایاب بن جانا یاس و حرمان کی علامت تو نہیں ہو سکتی۔ آنسو کی تشبیہات میں گوہر بھی ایک تشبیہ ہے مگر روتے روتے آنسو کی بوند گوہر نایاب بن کر رہ گئی کہنے میں نہ تخیل کا لطف ہے نہ بیان کی خوبی اس قسم کے پیش پا افتادہ مضامین و تشبیہات سے جب تک تمثیل کا کوئی پہلو نہ نکلے شعر میں جدت وخوبی پیدا نہیں ہو سکتی بہر حال یہ شعر جناب وجد کے شایانِ شان نہیں ہے۔ شہاب مہر ۱۳۴۶ف

اُلٹ دی گردشِ ایام نے بزمِ قطب شاہی
بجھا دی قصر عادل شاہ کی شمع سحر گاہی

لفظ قطب میں حرف دوم ساکن ہے اس لیے پہلا مصرعہ ناموزوں ہے کیوں کہ متحرک لکھا گیا ہے۔ صبح کا چراغ تو خود ہی بجھا دیا جاتا ہے گردشِ ایام پر اس کا مظلمہ کیوں۔

کوئی موتی لٹاتا تھا نہ اپنی چشم پُر نم سے
کوئی لیتا نہ تھا افتادگی کا درس شبنم سے

جب عشق و محبت کا وجود ہی نہ رہا تو چشم پُر نم کیوں ہونے چلی۔ چشم پُر نم سے موتی لٹانا بھی مہمل سی بات ہے۔ محاورہ بھی اس کی مساعدت نہیں کرتا۔ مقتضائے مقام تو اشکوں کا لفظ چاہتا ہے موتی بکھیرنا تو سُنا اور عرس حضرت خواجۂ اجمیری میں دیگ لٹاتے ہوئے بھی دیکھا مگر موتی لٹاتے نہ دیکھا نہ سُنا۔ اردو کے محاورہ میں سبق لینا کہتے ہیں درس "لینا" نہیں کہتے۔ شہاب آذر ۱۳۴۷ف

[۸] مخدوم محی الدین:۔ نظم "قمر"

شفق کی پیٹھ کے پیچھے سے آرہا ہے قمر
زمیں پہ نور کی چادر بچھا رہا ہے قمر

شفق اس سرخی کا نام ہے جو مشرق و مغرب میں طلوع یا غروب آفتاب کے عین ماقبل اُفق پر نمایاں ہوتی ہے۔ قمر کو شفق سے کوئی تعلق نہیں اس لیے یہ کہنا کہ "شفق کی پیٹھ کے پیچھے سے آرہا ہے قمر" نہ حقیقتاً صحیح ہے نہ کنایۃً دُرست مگر بلحاظ الفاظ "شفق کی پیٹھ" تبسّم پاش ضرور ہے۔

اُداس رات ہے افلاس ہے غلامی ہے
کفن سے منہ کو نکالے ڈرا رہا ہے قمر
کہاں ہے ساقی گلرو کہاں ہے سُرخ شراب
فسانۂ غم گیتی سُنا رہا ہے قمر

ختم کلام کے یہ دو شعر تعریف و توصیف سے مستغنی ہیں بار بار پڑھیے اور لطف حاصل کیجیے۔ آخر میں اس امر کا اظہار بھی ناگزیر ہے کہ باوجود سعی بلیغ بعض اشعار کے تعلق سے ہمارے فہم و اندیشہ کا دامن خالی ہی رہا۔ شہاب شہر پور ۱۳۴۹ف

بخوف طوالت ہم نے شعراء کے ایک دو شعر لکھنے پر اکتفا کیا ورنہ جناب عطارد نے ان شعراء کے علاوہ دوسرے شاعروں کی تقریباً پوری غزلوں اور نظموں پر نقد و نظر و تبصرہ کیا ہے اور یہ سلسلۂ رسالہ شہاب میں برسوں جاری رہا۔

اس کے علاوہ اساتذہ سخن غالب داغ اور شبلی وغیرہ کے کلام پر جو اصحاب نکتہ چینی یا اعتراض کرتے تھے ان کا مدلل جواب بھی لکھا کرتے تھے۔ چنانچہ حضرت نظم طباطبائی اپنی تالیف شرح دیوان غالب میں غالب کے اشعار پر محاورہ، زبان وغیرہ کی نسبت جو اعتراضات کئے تھے اور جن کی صحت میں شبہ تھا اس کا نہایت پراز دلائل اور مستند جواب عطارد نے دیا:۔

تماشہ کر اے محو آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

اعتراض: اردو میں خالی تماشہ کہدینا کافی نہیں ہے۔

جواب: دیوان غالب کے پہلے ایڈیشن میں شاید "کر" کے عوض "کہ" لکھا گیا یا طباعت میں "کر" کی "ر" پر سیاہی نہ آئی۔ یہ ایک معمولی بات ہے اور ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ صرف "تماشہ" نہ فارسی میں بہ معنے تماشہ کردن مستعمل ہے نہ اردو میں۔ درحقیقت مصنف نے "تماشہ کر" ہی لکھا ہوگا دوسرے تمام ایڈیشنوں میں "تماشہ کر" ہی ہے۔ اردو میں تماشہ کرنا کے معنے ہیں شعبدہ دکھانا یا ایسا کام کرنا جس کو رغبت سے دیکھا جائے

منہ نہ دکھلاوے نہ کھلا بر اندازِ عتاب
کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلادے مجھے

اعتراض: آنکھ دکھلانا محاورہ ہے خفا ہونے کے معنے میں مصنف نے آنکھیں دکھلانا بصیغہ جمع باندھا ہے مگر فصیح وہی ہے کہ آنکھ دکھانا کہیں بافراد۔

جواب: معلوم نہیں مولانا طباطبائی کے نزدیک آتش و ناسخ بھی فصیح تھے یا نہیں غالب اور ذوق تو دہلوی ہیں:

ناسخ ~ دکھائیں یار نے آنکھیں چھپا کے چھاتی کو
عطا کئے مجھے بادام اثار کے بدلے

آتش ~ آنکھیں عاشق کو نہ تو اے گل رعنا دکھلا
پتلیوں کا کسی نادان کو تماشہ دکھلا

ذوق ~ مسجد میں اس نے ہم نے آنکھیں دکھا کے مارا
کافر کی دیکھو شوخی گھر میں خدا کے مارا

لو یدا من ہے بیداد دوست جان کے لیے
رہا نہ طرز ستم کوئی آسمان کے لیے

اعتراض: لفظ طرز پہلے مونث تھا اور دلی میں اب بھی مونث ہے مگر لکھنؤ میں عام محاورہ اس کے تذکیر کا ہے ہاں چند غزل گو جو زبان میں قیاس کرتے

ہیں وہ اب بھی مونث باندھتے ہیں لیکن خلاف محاورہ معلوم ہوتا ہے کانوں کو۔

جواب: لفظ "طرز" پہلے سے مختلف فیہ ہے جیسا کہ ہسیوں الفاظ میں شیخ ناسخ نے بھی مونث لکھا ہے ہماری سمجھ میں نہ آیا کہ مولانا کس بنا پر اس کو خلاف محاورہ کہتے ہیں جب یہ تسلیم ہے کہ دہلی میں اب بھی یہ لفظ تانیث ہی بولا جاتا ہے۔ بہت سے ایسے الفاظ ہیں جن کی تانیث و تذکیر میں اختلاف چلا آتا ہے ایسے الفاظ کی نسبت کسی کو خلافِ محاورہ کہنے کا کیا حق ہے۔ حکیم سید ضامن علی صاحب جلال لکھنوی جو اپنے وقت کے استادِ سخن سمجھے جاتے تھے اور غالباً مولانا طباطبائی کے ہمعصر بھی تھے اپنی مولفہ کتاب "رسالہ تانیث و تذکیر" میں لکھتے ہیں:

"بیشتر فصحا کے عندیہ میں طرز مونث ہے اور مولف بھی اس کی تانیث کا قائل ہے۔"

پیچ آ پڑی ہے وعدہ دلدار کی مجھے
وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے

اعتراض: مگر کے معنے پر (پہ) سے پر فصیح ہے اور یاں سے یہاں بہتر ہے۔ یعنے دوسرا مصرع یوں ہوتا... "وہ آئے یا نہ آئے یہاں انتظار ہے"۔ تو اس میں (پہ۔ یاں) کے نکل جانے سے بندش اچھی ہو جاتی اور (پہ) کا حذف کرنا محاورے میں بہت ہے کچھ معنے میں خلل ہی نہ آتا۔.... عود ہندی میں پیچ کا لفظ مصنف کی زبان پر بہ تذکیر ہے مگر اس شعر میں تانیث۔ غالباً یہ سبب ہوا کہ پہلے یہ دیوان لکھنؤ میں چھپا وہاں کاتب نے تصرف کر دیا۔ پھر مصنف نے بھی اُسے یونہی رہنے دیا۔

جواب: مولانا کے دو اعتراض ہیں ایک (پہ اور یاں) پر دوسرا پیچ تانیث و تذکیر پر۔ اس میں شک نہیں کہ شعرائے متاخرین نے صرف استثنٰی کے معنے پر (پہ) کے استعمال کو غیر فصیح قرار دیا مگر یاں اور واں آج بھی رائج ہیں اصل میں یاں اور واں یہاں اور وہاں کبھی ہے صورت اول میں (ہا)

کو مخلوط التلفظ پڑھا جائے تو رسم الخط میں تبدیلی کی بھی ضرورت نہیں۔ امیر مینائی۔ ؎

واں لگا ہیں تیز تیز اور یاں تھیں آہیں دلا دخیز
وصل کی شب اس طرف افسوں ادھر افسانہ تھا

استاد داغ ؎

قبر میں بھی نہ بجھی آتش غم وائے نصیب
ہم جہاں دفن ہیں واں زیر زمیں آب نہیں

یہ ایک عجیب بات ہے کہ پہلی اشاعت کے علاوہ مابعد کی تمام اشاعتوں میں دوسرا مصرعہ اس طرح ہے ع

وہ آئے یا نہ آئے یہاں انتظار ہے

پہلے ایڈیشن کی تصحیح اگر خود مصنف نے کی ہے تو یہ لازم نہیں کہ سہو کاتب کا ہر جز و کل سہو نظر سے بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ کیوں نہ اس کو کاتب کی غلطی قرار دیجائے مگر نہیں کاتب لکھنوی، مطبع بھی لکھنو کا پھر ایسی بدگمانی ان سے کیوں کی جائے۔

پیچ بلا اختلاف دہلی اور لکھنو دونو جائے مونث ہی بولا جاتا ہے اگر عود ہندی میں تذکیر لکھا گیا ہے تو کہنا کہ "مصنف کی زبان پر یہ لفظ بتذکیر ہے۔ دیوان چونکہ لکھنو میں طبع ہوا تھا کاتب نے تصرف کر کے تانیث لکھ دیا اور مصنف نے بھی اس کو رہنے دیا" مولانا کی عجیب و غریب حجت ہے کہیں تو کاتب کی غلطی کو اس لیے تسلیم نہیں کیا جاتا کہ کاپی کی تصحیح خود مصنف نے کی کہیں کاتب کی غلطی اس انداز سے تسلیم کی جاتی ہے کہ گویا کاتب لکھنوی نے مصنف کی غلطی کی اصلاح کردی جس کو مصنف نے بھی قبول کر لیا۔ دہلی اور لکھنو کی ایسی رقابت میں خدا جانے کیا لطف ملتا ہے۔

ت کفیل عمر و اسد خاں نشاط
مرگ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

اعتراض: دو ہندی جملوں میں حرف عطف فارسی کا ہے یعنے (غفلت کفیل عمر ہے واسد ضامن نشاط) دیکھو واؤ فارسی کا یہاں کیسا برا معلوم ہوتا ہے یا یوں سمجھو کہ (غفلت کفیل عمر ہے اور اسد ضامن نشاط ہے) بہرحال دونو ہندی جملہ اور حرف عطف فارسی کا بُرا ہے۔ اس سبب سے کہ "ہے" کا لفظ یہاں مذکور نہیں مقدور تو ہے ہاں یہ تاویل کرلو کہ پہلا مصرعہ فارسی کا ہے۔

جواب: تلاش عیوب کے انہماک و استغراق میں ہنر بھی عیب نظر آتا ہے پہلا مصرعہ صریحاً فارسی ہے کسی تاویل و تعبیر کی مطلق ضرورت نہیں خواہ مخواہ لفظ "ہے" کو مقدور فرض کرنا سراسر ناانصافی ہے مدرسہ کا طالب علم بھی اس سے ناواقف نہیں کہ دو ہندی جملے یا دو ہندی الفاظ کا عطف فارسی (واو) سے ناجائز ہے اگر مولانا طباطبائی اس کو صفت تلمیح قرار دیتے تو کیا ہرج تھا۔ شہاب مورخہ ۲۷ فروری ۱۹۳۶ء

ان کی ادبی سرگرمیاں صرف تنقید اور جواب تنقید تک محدود نہیں ہیں بلکہ اردو شعر و ادب پر بڑے نکتہ سنجانہ اور پُراز معلومات مضامین ان کے قلم کے رہن منت ہیں جو یقیناً ادب کے قیمتی سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ادبی و تحقیقی کام کرنے والوں کی نہ صرف حوصلہ افزائی کرتے تھے بلکہ ان کے کام میں ان کی رہنمائی اور مدد کرتے تھے چنانچہ مرقع سخن جلد اول، دوم اور چہارم اور "فیض سخن" کی ترتیب و طباعت کے وقت ڈاکٹر زور کی خواہش پر دکن کے بعض شعراء کا کلام اور حالات زندگی لکھ کر انھیں بھجوایا جس کا اعتراف، تعریف اور شکریہ ڈاکٹر زور نے ان کتابوں میں کیا ہے۔

دکن کی سرزمین پر بے مثل شاعر، ادیب اور نقاد و محقق پیدا ہوئے لیکن یہ حقیقت بڑی افسوسناک ہے کہ خود اہل دکن نے اپنے باکمالوں کی قدر نہیں کی اور باہر سے آنے والے شاعر اور فن والوں ہی کی قدر و منزلت ہوتی رہی۔ تب ہی تو مائل دکنی نے بے مہری یاران وطن پر یہ طنز

کیا ہے ۔

نشو و نما پائی ہے دکن میں قدر ہماری کیا ہوگی
گھر کی مرغی دال برابر کس کو دکھائیں اپنا ہنر ہم

بیرونی شعرا اور مشاہیر جن پر بے شمار کتابیں اور مضامین لکھے ہوئے ہیں ان پر یہاں سمینار ہوتے ہیں ان پر مقالے پڑھے جاتے ہیں لیکن دکن کے بلند پایہ اساتذہ سخن، بے مثل ادیبوں اور ہمہ دان کامل الفن نقادوں اور محققین سے خود اہل وطن ناواقف ہیں۔ نہ ان پر ریسرچ ہوتا ہے نہ سمینار ہوتا ہے نہ مضامین لکھے جاتے ہیں نتیجتہً یہ باکمال پردۂ گمنامی میں روپوش ہوتے چلے جاتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ بعض تو ایسے بھی ہیں جنھوں نے ان باکمالوں کے تحقیقی اور ادبی کارناموں کو شک شبہ کی نظر سے دیکھا ہے۔

نواب عزیز یار جنگ عزیز نے جناب فانی بدایونی کے مجموعہ کلام "باقیاتِ فانی" پر سخنورانہ تنقید کی جسے جناب ڈاکٹر سید محی الدین زور نے "نقدِ سخن" کے نام سے ادارہ ادبیات اردو کی جانب سے شائع کیا تھا لیکن بعضوں نے نواب عزیز کو فانی کے مخالف گروپ کا سمجھا اور ان کی تنقیدوں کو بدنیتی اور رشک و حسد پر محمول کیا کہ اس کا مقصد مہاراجہ بہادر شاد کے دربار میں جناب فانی کی وقعت کو گھٹانا قرار دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نواب عزیز، مہاراجہ بہادر شاد کے بااعتماد دوست تھے۔ جو لوگ ان کی شخصیت سے واقف ہیں جانتے ہیں کہ شاعروں کی جتھہ بندیوں سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا وہ بڑے مستغنی المزاج اور ریاونا ہستی تھے شاعروں کے قدر دان اور شعر و ادب کے خاموش خدمت گزار تھے ان کی تنقیدیں خالص علمی و تحقیقی مباحثہ کا درجہ رکھتی ہیں اس کا مقصد زبان اردو کی ترقی اور اسے سنوارنا اور نکھارنا ہے ذاتی منفعت اور شہرت یابی سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اس طرح ان کے بھائی جناب عطا

نے بھی جو تنقیدیں کی ہیں وہ ایک ادبی کارنامہ کے درجہ میں ہیں ان تنقیدوں میں کسی کی خصومت کو دخل نہیں ہے۔

دراصل نواب عزیز اور ان کے بھائی عطارد دکن کے ان فرزندوں میں ہیں جنھوں نے اہلِ وطن کے احساس کمتری اور اس مرعوب ذہنیت کو دُور کرنے کی کوشش کی کہ زبان دانی صرف دہلی یا لکھنؤ کی میراث ہے۔ دکن والے اہلِ زبان نہ سہی لیکن ایسے زبان داں ہیں کہ دہلی و لکھنؤ کے دعویداران سُخن کے کلام میں زبان و بیان، محاورہ کی غلطی، صرف و نحو کے قاعدوں سے انحراف پر گرفت کرنے کی کما حقہٗ صلاحیت اور اہلیت رکھتے ہیں۔

جناب عطارد کا انتقال بعمر (۹۶) سال ان کے مکان کریم منزل قاضی پیٹھ میں بتاریخ ۳ / مئی سنہ ۱۹۶۶ء (۱۳۸۶ھ) ہوگیا۔ ان کی تدفین حضرت افضل شاہ بیابانیؒ کے پائیں میں ہوئی۔ اللہ غریقِ رحمت فرمائے۔

جناب عبدالرزاق صاحب بسمل ایڈیٹر رسالہ شہاب (حیدرآباد دکن) نے جو جناب عطارد کے قدیم قریبی دوست تھے انھیں اپنے ایک خط میں لکھا تھا:۔

"بیشتر حضرات کا تقاضہ ہے کہ اب تک جو تنقیدیں آپ کی شائع ہوچکی ہیں اگر وہ کتابی صورت میں یکجا کردی جائیں تو نہایت سود مند ثابت ہوں گی۔ اس مسئلہ میں آپ بھی سوچئے جب کہ فانی پر تنقیدیں کتابی صورت میں نکل چکی ہیں تو یہ بھی اکھٹا طبع کرنے میں آپ کو تامل نہ کرنا چاہیئے۔ ایک مستقل شئے طالب علم اور اربابِ ذوق کے ہاتھ آجائے گی۔ بہرحال آپ کے صواب دید پر منحصر ہے۔"

(خط ناچیز کے پاس محفوظ ہے)

معلوم نہیں اس خط کا جناب عطارد نے کیا جواب دیا لیکن یہ حقیقت ہے کہ اپنی گرانقدر تنقیدوں اور معلومات افزا مضامین کو یکجا کر کے کتابی صورت میں شائع کرنے میں اُنہوں نے کوئی دل چسپی نہیں لی اور یہ قیمتی

ادبی سرمایہ رسالہ شہاب کے ماہ ناموں میں بکھرا پڑا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر مغنی تبسّم صاحب جو سلف کے کارناموں کو منظرِ عام پر لانے ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں۔ انھیں جب یہ معلوم ہوا کہ جناب عطارد میرے بزرگوں میں ہیں تو موصوف نے مجھے خط لکھا اور فون پر اس خواہش کا اظہار فرمایا کہ جناب عطارد پر میں ایک تعارفی مضمون لکھوں اور ان کی تنقیدوں پر تبصرہ کروں۔ باوجود کم علمی تعمیل ارشاد میں تعارفی مضمون لکھنے کی کوشش کی ہے اب رہا تنقیدوں پر تبصرہ کرنا تو یہ کسی اہلِ علم اور نقادِ سخن ہی کا کام ہے۔

صدق جائسی مہاراجہ شاد کے دربار میں!

ان کا نام نامی مرزا تصدق حسین تھا۔ جائس ضلع رائے بریلی لکھنؤ کا ایک مردم خیز قصبہ ہے یہیں وہ پیدا ہوئے اور یہیں پروان چڑھے۔ ابتدائی تعلیم کہاں ہوئی اور اعلیٰ تعلیم کس درس گاہ میں پائی یہ کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ بہرحال ان کی عمر کا ایک بڑا حصہ شمالی ہند میں گزرا۔ وہ پہلے پہل سنہ ۱۹۲۳ء میں حیدرآباد وارد ہوئے اور اپنی شاگردی کی نسبت سے استاد السلطان جلیل القدر نواب فصاحت جنگ جلیل کی ڈیوڑھی جلیل منزل واقع بازار نور الامراء میں مہمان بطور فروکش ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ حیدرآباد میں ترقی تعلیم کا ہر طرف چرچا تھا۔ بلدہ و اضلاع میں نئے نئے مدارس کھل رہے تھے۔ جامعہ عثمانیہ کے ساتھ دارالترجمہ کے قیام کو چند ہی سال ہوئے تھے سارے ہندوستان میں اس کی شہرت تھی۔ گوشہ گوشہ سے مشاہیر علم و فضل بلائے جا رہے تھے۔ صدق صاحب نے بھی اسی مقصد سے حیدرآباد کا رُخ کیا تھا۔ جامعہ عثمانیہ کی پروفیسری کے اُمیدوار تھے۔ جلیل منزل میں قیام کے دوران جو آٹھ ماہ تک رہا، حیدرآباد کے باا ثر حلقوں میں اپنا اثر و رسوخ پیدا کر چکے تھے۔ مہاراجہ کشن پرشاد پیشکار دولت آصفیہ کے دربار میں بھی رسائی تھی۔ مہاراجہ اہلِ علم کے نہ صرف قدرداں تھے بلکہ حتی الوسع ان کی دستگیری بھی کیا کرتے تھے۔ مگر ان دنوں وہ صدارت عظمیٰ سے سبکدوش تھے۔ صدق صاحب کی مدد سے قاصر رہے ریاست حیدرآباد میں ملازمت کے لیے صداقت نامہ ملکی کا لزوم تھا۔ بیرونی افراد کے لیے حصولِ ملازمت میں یہی سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ صدق صاحب ملازمت کے لیے کوشاں تھے۔ اس اثناء میں انہوں نے بڑی کوشش و کاوش سے صداقت نامہ ملکی تو حاصل کر لیا مگر

حیدر آباد میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑی جس سے محفوظ رہنے کے لیے انھیں ناچار وطن لوٹ جانا پڑا۔ وہاں کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ ایک دو ماہ نہیں لگاتار چار سال گزر گئے۔

حیدر آباد کی کشش ایسی رہی کہ وہ یہاں آئے بغیر نہ رہے۔ اس مدت مدید میں حیدر آباد کے حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ چودہ برس کی سبکدوشی کے بعد مہاراجہ کشن پرشاد پھر صدارت عظمیٰ پر فائز ہوئے جس سے حیدر آباد کے عوام میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ صدق صاحب نے اس موقع کو غنیمت جان کر اٹھائیس ۲۸ اشعار کا ایک قطعہ تہنیت لکھا اور مہاراجہ کے ہاں پہنچ کر سر دربار اپنے خاص انداز میں سنایا۔ چند شعر یہ ہیں:۔

جس دن سے تھی صدارت عظمیٰ پہ قیل و قال
اہلِ دکن کے دل کے بہت اضطراب میں

پیچ ایسا آ پڑا تھا کہ ارباب حل و عقد
رہتے تھے جس سے آٹھ پہر اضطراب میں

خود بادشاہ کھوج میں مدت سے تھے مگر
جچتا نہ تھا کوئی نگہہ انتخاب میں

چھائی ہوئی گھٹا تو غم انگیز تھی مگر
دل بولتا تھا چاند بھی ہے اس سحاب میں

شکر خدا کہ گلشن عالم کے دن پھرے
آئی بہار باغِ جہانِ خراب میں

جس ماہ آسمان وزارت کے دور میں
ظلمت کا منہ کسی نے نہ دیکھا تھا خواب میں

چودہ برس کے بعد وہی چودویں کا چاند
پرتو فگن ہے پھر شرف آفتاب میں

کافر بُتوں کے سامنے سجدے میں گر پڑے
زاہد نے شکر بھیجا خدا کی جناب میں

خالی ہے زر سے ہاتھ تو آیا ہوں شرمسار
دست یمین شاہ دکن کی جناب میں

ایسا ہے دل کا مجھ سے کہ گوہر نثار کر
موتی ہیں کچھ ابھی مری چشم پُر آب میں

اے نور و نار عرصۂ ہستی کے بادشاہ
جب تک ضیا ہے ماہ میں نور آفتاب میں

دولت جنابِ شاد کے قدموں سے منہ ملے
نصرت رہے جلو میں سعادت رکاب میں

اہلِ دربار اپنی جگہ لُطف اندوز ہوئے اور خود مہاراجہ اس درجہ متاثر ہوتے کہ شاداں و فرحاں اپنی مسند سے سرو قد اٹھ کر داد و تحسین دی۔

ادھر جامعہ عثمانیہ میں صدق صاحب کے تقرر کا مسئلہ درپیش تھا انھیں قوی اُمید تھی کہ مہاراجہ کی توجہ سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے لیکن ایک مشکل یہ آپڑی تھی کہ جامعہ عثمانیہ میں پروفیسری یا لکچراری پر تقرر کے لیے سند قابلیت درکار تھی جس سے استثنا کی کوئی صورت نکل نہ سکی۔ بالآخر صدق صاحب اس کے متبادل کسی اور جائیداد پر تقرر کے لیے مہاراجہ کا تعاون چاہتے تھے جس کا وعدہ بھی تھا مگر اس میں تاخیر پر تاخیر ہو رہی تھی جو جناب صدق کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ ان کا پیمانۂ صبر چھلک گیا۔ ایک شکوہ آمیز قطعہ لکھا اور بھرے دربار میں مہاراجہ کو پیش کیا۔ انھوں نے صدق صاحب کی زبانی سُننے کی خواہش کی۔ پھر کیا تھا۔ جناب صدق نے بہت جوش و خروش سے وہ قطعہ پڑھا۔ ابتداء کے چند شعر مدح و توصیف میں تھے وہ مہاراجہ نے بڑے شوق

سے سنئے:

اے سکندر حشم و حاتم دفیاض و رحیم
اے فریدوں خدم و باذل و ذی قدر و جلیل

ترے اخلاق تری نیک دلی پر شاہد
تیرے الطاف تری بندہ نوازی پہ دلیل

تیری ہر بات حکیموں کے لیے قابلِ قدر
تیرا ہر فعل زمانہ کے لیے اک تمثیل

تیرا ہر لفظ ہے گنجینۂ معنیٰ کا طلسم
تیرے ہر فقرے کی سو طرح سے ممکن تاویل

دستگیر اہلِ ہنر کی تری ذی حوصلگی!
سیر چشمی تری ہر صاحبِ حاجت کی کفیل

شاعری میں مجھے حاصل تجھے بخشش میں کمال
مثل میرا ہی زمانے میں نہ تیرا ہی عدیل

فخر ممدوح کی عزت سے ہے مداح کو بھی
یہ وہ دعویٰ ہے تری شان ہے جسکی دلیل

جب آگے یہ چبھتے ہوئے شعر پڑھے گئے:

شرم آتی ہے جو احباب کبھی پوچھتے ہیں
آج تیرے لیے کیا کوئی نکلی نہ سبیل

دم ہے سینہ میں خفا آتی بھی تاخیر ہے کیا
گو یہ تاخیر ہے مقصد پہ درستی کی دلیل

شوق بے چین اِدھر اور تمنا بے تاب
مدتِ وعدۂ جاں بخش اُدھر طول طویل

ایسے وعدہ کو ہے درکار حیاتِ الیاس
اس سے سر بر نہیں ہو سکتی مری عمرِ قلیل

قدر دانی تو ترے دل پہ ہے موقوف مگر
قابل داد نہیں کیا یہ اچھوتی تخئیل

کس کی توہین ہے عالم میں اہانت میری
کس کی ذلت ہے زمانے میں رہائی جو ذلیل

ہمزبان ہو کے مرا غالبؔ آشفتہ بیان
تیری خدمت میں ان اشعار سے کرتا ہے اپیل

"نیک ہوتی مری حالت تو نہ دیتا تکلیف
جمع ہوتی مری خاطر تو نہ کرتا تعجیل"

"قبلۂ کون و مکان خستہ نوازی میں یہ دیر
کعبۂ امن و امان عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل!"

مہاراجہ مسکرانے لگے۔ ان کی مسکراہٹ معنی خیز اور امید افزا تھی۔ بعد چندے ان کے ایما سے جناب صدق کا تقرر مدرس فوقانیہ دار العلوم بلدہ کی مدرسی پر عمل میں آیا اور یہ سلسلۂ ملازمت تا وظیفہ حسن خدمت جاری رہا۔

مصنف کی زیر ترتیب کتاب [صدق جائسی، سوانحی خاکہ اور کلام] سے۔

حُسنِ ترجمہ

عبدالرحمٰن عمادی علامہ عمادی کے محبوب ترین بھائی تھے عمر میں گو ان سے چھوٹے تھے مگر علومِ مروجہ میں اپنی مثال آپ تھے۔ آپ کے حضور میں حافظ علیہ الرحمۃ کا یہ شعر پڑھا گیا۔

قتل ایں خستہ بشمیر تو تقدیر نبود
ورنہ ہیچ از دل بیرحم تو تقصیر نبود

آنمرحوم نے فی البدیہہ یہ شعر پڑھا:

تہ تیغ ہوں ایسی مری تقدیر نہ تھی
ورنہ تیرے دل بے رحم کی تقصیر نہ تھی

صاحبزادہ عثمان عمادی (فرزند علامہ عمادیؒ) نے حافظ کا یہ مشہور شعر ؎

آسائش دو گیتی تفسیر ایں دو حرفست
با دوستاں تلطف با دشمناں مدارا

سُنا تو اس کو یوں اردو قالب میں ڈھال دیا:

دونوں جہاں کی خوشیاں دو حرف میں ہیں مضمر
یاروں سے کر تلطف دشمن سے کر مدارا

صاحبزادہ عثمان عمادی ایک دن امام الفن نواب فصاحت جنگ جلیلؔ سے ملنے گئے۔ نواب صاحب کا خطاب جیسا جلیل القدر تھا ویسے ہی وہ جلیل القدر شاعر ہونے کے ساتھ اعلیٰ مکارمِ اخلاق و حسنِ التفات سے ممیز تھے۔ ان کو دیکھا تو کھڑے ہو گئے اور اس خلوص سے ملے گویا دیرینہ مجالست و موانست تھی نہایت مہربانی سے خیریت اور گھر کے حالات پوچھنے لگے اور ادب کی باتیں ہونے لگیں اس اثنا میں کچھ اور لوگ بھی آگئے اور شعر و شاعری کا بازار گرم

ہو گیا جس میں کم عیار ٹکسال سے باہر ہو گئے اور سیم و زر کے خالص سکّے چلنے لگے باتوں باتوں میں کسی نے حضرت جلیل کا شعر پڑھا

مست کرنا ہے تو خم منہ سے لگا دے ساقی
تو پلائے گا کہاں تک مجھے پیمانے سے

سُن کر مسکرایا اور اسی مفہوم کو فارسی میں یوں ادا کیا ؎

خواہی مستم کنی خم را بہ لبم دہ ساقی
با تنک ظرفیٔ پیمانہ تسلّی تا کے

حضرت جلیل بے حد خوش ہوئے اور ہاتھ بڑھا کے مصافحہ فرمایا اور بڑی تعریف کی
اِسی محفل میں استاد جلیل کے دو اور شعر پڑھے گئے:

جب تم ملے نہ تھے تو جُدائی کا تھا ملال
اب یہ ملال ہے کہ تمنا نِکل گئی

خدا جانے حقیقت کیا ہے لیکن میں یہ سُنتا ہوں
اُٹھے گا فِتنۂ محشر تمہاری چشم پُر فن سے

ان اشعار پر یوں طبع آزمائی کی:

تا دیدمت ملال تمنات داشتم
اکنون ملال ایں کہ تمنا فراغ شد

حقیقت را نمی دانم ز یاراں ایں خبر دارم
کہ چشم پُر فنت آں فِتنۂ محشر کند برپا

ایک صاحب نے حافظ کا یہ شعر پڑھا:

دلے کہ غیب نمایست و جام جم دارد
ز خاتمی کہ ازو گم شود چہ غم دارد

اس پر برجستہ کہا:

وہ دل جو غیب نما اور جام جم سا ہو
اسے اک خاتم گم گشتہ کا الم کیا ہو

مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد کا خط

مئی ڈیر عزیز یار جنگ بہادر

آپ کا محبت نامہ مع غزل پہونچا. مشاعرہ کے روز بہت دیر تک میں منتظر تھا کہ آصف یاور الملک بہادر یا آپ حسبِ عادت مجھے طلب کریں تو آؤں لیکن کون یاد کرتا ہے. خیر میرا کلام آپ سے اور سامعین کے جو پسند آیا اور پڑھا گیا گویا میری حاضری ہوگئی. آپ نے غزل بہت اچھی کہی. کلام کی پختگی اور محاورہ اور تشبیہن استعاروں کا لطف اب ترقی پر ہے

اللّٰھُمَّ زِد فزد.

آپ کی فرمائش تھی اس لیے ان غزلوں کے لکھنے میں کسی قدر طبیعت پر زور دیا گیا ورنہ اب میں بہت کم لکھتا ہوں اور ایسی وجہ سے تکلف بھی ہوا ورنہ بیس پچیس شعر اناپ شناپ کہدینا مرے نزدیک ایک معمولی بات تھی ہائے کیا کہوں.

سینہ و دل حسرتوں سے چھا گیا
بس ہجوم یاس جی گھبرا گیا

آصف پرشاد کی موت نے کہیں کا نہ رکھا. آپ کی غزل کا ایک شعر بالکل مرے حسبِ حال ہے اور درحقیقت آج کل مرا یہی حال ہے.

ہم تو کچھ اور ہی عالم میں رہا کرتے ہیں۔ نہ تو ہوتی ہے مسرت نہ تو غم ہوتا ہے

پرسوں شب میں دو بجے تک نیند نہیں آئی۔ دل پُرغم کو بہلاتا رہا. کچھ اشعار جو موزوں ہوئے ہیں وہ رشتہ دوز ہیں. ایک جلد فریاد شاد کی بھی بھیجتا ہوں۔ یہ مرے فرزند کے غم کا مرثیہ ہے. دُعا کیجیے کہ خُدا مرے حال پر رحم کرے. بھئی اب تو برسوں درشن کو نینان ترست ہیں.

شرح دستخط مہاراجہ شاد